ایک تنقید ○ ایک تحقیق ○ ایک ارتقا

نہج البلاغہ

کا ادبی مطالعہ

از

جناب مولانا مرتضیٰ حسین صاحب قبلہ فاضل

نشریہ نمبر ٢١

ادارۂ تعلیماتِ الٰہیہ کراچی

قیمت :- ٨ آنے

(ایجوکیشنل پریس کراچی)

کتابخانہ مرتضوی، یادگار علامہ فاضل لکھنوی، کراچی، پاکستان

murtazavilibrary@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کے خزانۂ عالی میں دو بڑی قیمتی چیزیں ہیں، فرمودات پیغمبر اسلامؐ اور ملفوظات امیر المومنین علیہ السلام، صاحبانِ نظر نے فرموداتِ پیغمبرؐ میں سے وحی اعجاز کو قرآن سمجھا اور الہام معجزہ کی قوت نے اسے سرمایۂ بصیرت و دولتِ حکمت و خزانہ مانا، احادیث بھی چونکہ حضورؐ ہی کے دہنِ مبارک سے بکھرے ہوئے موتیوں کا نام ہے اسلئے اپنوں اور بیگانوں نے پوری توجہ دی تفسیریں لکھی گئیں، شرحیں قلمبند ہوئیں، پڑھنے اور پڑھانے کو ثواب مانا گیا اور ہر ایک مسلمان نے اس ذخیرہ کو اپنانے میں سعادت محسوس کی اور انشاء اللہ جب تک اسلام ہے اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ملفوظاتِ جناب امیرؑ جناب امیرؑ ہی کیطرح ماضی کے نشیب و فراز میں اپنے تاریخی لمحات گذارتے رہے، یعنی جس طرح علی ابن ابیطالب علیہ السلام ہر مشکل میں مشکلکشا، ہر عقدے میں گرہ کشا، ہر موڑ پر رہنما، ہر سختی میں مسیحا صفت تھے مگر موقع کے گواہ اور مورخ کے قلم اس واقعہ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے رہے، اسی طرح انکا کلام ہر متکلم کی زبان پر تھا، ہر انشاء پرداز کے حافظہ میں تھا، ہر ادب و فکر کا سرمایۂ اصلی تھا، مگر لوگ نام لیتے ڈرتے تھے یا جان بوجھ کر ان منزلوں پر خاموش ہو جاتے تھے، جہاں خاموشی جرم ہے۔

مگر دبی چنگاریاں اور چھپی آگ اپنی حرارت سے راکھ کو بہرحال گرم رکھتی ہے، مشک اپنی خوشبو کے ذریعے انسان کو نام لینے اور ذکر کرنے پر مجبور کرتی ہے، اور آدمی خواہ کسی طرح سے

اس جذبۂ انفعال سے مجبور ہو کر کچھ نہ کچھ کہنے لگتا ہے، پھر یہی کچھ "قطروں کی طرح سمندر" اور ایک ایک دانۂ مروارید کی طرح خزانہ تلاش کرنے والوں کے لئے خزانہ بن جاتا ہے، زیرِ نظر کتاب میں بڑی عرق ریزی کے بعد اسی قسم کے موتیوں کو تلاش کر کے خزانہ کی شکل دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ادب و تحقیق، تنقید و تاریخ کی روشنی میں حضرت امیر المومنینؑ، تلمیذ ختم المرسلینؐ، خلیفۂ ربّ العالمین، علی ابن ابیطالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ملفوظات کی کیا اہمیت تھی اور آپ کی تقریروں، تحریروں، جملوں اور شعروں نے عربی ادب اور دین کو کیا دیا۔

اگر ایک مسلمان کیلئے عربی زبان کی کوئی اہمیت ہے اور اسلام میں عربی زبان و ادب فہم قرآن و حدیث، تفہیم نظریاتِ اسلام کیلئے ضروری ہے تو کلامِ علیؑ اپنی اولیت، ندرت، جامعیت اور معنی آفرینی، شخصیت و کردار کے صحیح توازن، نفسیاتی رجحانات و افکار کی آئینہ صفاتی کی بناء پر مطالعہ طلب ہے، تاریخ و ادب کے دفتروں میں پھیلے ہوئے دریا کا وہ خوبصورت دھارا اور عرفان انگیز سمندر ہے جسے سید رضیؒ نے نہج البلاغہ میں سمیٹا ہے، علومِ اسلام کے محقق اور تعلیماتِ خدا و رسولؐ کے مفکروں نے ہمیشہ اسے پیشِ نظر رکھا، اور مستقبل بعید کے آخری عہد تک آنیوالی نسلیں فائدہ اٹھائینگی۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ نہج البلاغہ خصوصاً اور کلامِ علی ابن ابی طالب علیہ السلام عموماً ادبی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور اسکے تأثرات و حاصلِ مطالعہ کو اہلِ فکر و نظر کے سامنے پیش کریں، تاکہ اسلام دوست اور مسلمان، عربی داں اور غیر عربی داں ناظرین یہ اندازہ لگا سکیں کہ امیر المومنینؑ کے اعمال کی طرح انکے اقوال بھی معجزہ تھے، اور ایسا معجزہ کہ ماضی و حال و مستقبل اس سے روشنی حاصل کرتے رہیں، زمانے کے ساتھ ساتھ ذہن و علم کی ترقیاں اگر ان اقوال سے قریب ہوں تو یہ محیر العقول تحریریں اور تقریریں عصرِ حاضر کو بہت سے معاملات و مسائل سمجھانے میں مدد دیں گی۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام بہادر تھے، لیکن فقط بہادر تھے، شامی افسروں نے یہی مشہور

کیا تھا، کیونکہ اس عہد کے تمام طبقے حتیٰ کہ دور و دراز کے بادیہ نشین عرب بھی علیؑ کی تلوار دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا "بہادر" کہہ کر فضیلتوں کو مختصر بلکہ ختم کر دیا گیا، علیؑ "خلیفہ راشد" تھے، گویا ایک تقدس دے کر اُن کی عزت افزائی کر دی گئی، میں کہتا ہوں کہ علیؑ کو فوق البشر "انسان" کہنے میں کیا عذر ہے؟ تاریخ ان کے کردار اور نہج البلاغہ اور دیوان ان کے اقوال کا خزانہ ہیں، صحیفۂ علویہ بھی ملا کر علیؑ کا نفسیاتی جائزہ قلمبند کیا جائے، پھر ان حاصل شدہ نتائج کو مرتب کر کے دیکھا جائے تو اس جملے کی شرح ہو گی۔

يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ — ہم سے چشمے اُبلتے اور سیلاب بہتے ہیں، اور

وَلَا يَرْقَى إِلَيَّ الطَّيْرُ — ہماری بلندیوں تک طائر بھی نہیں پہنچ پاتے۔

علیؑ مسلم اوّل، مجاہد اوّل، حکیم اوّل، مفسر اوّل، امام اوّل، رسالت کا معجزۂ اوّل ہیں، جن کی ذات میں آدمؑ کی صفوت، نوحؑ کی عظمت، ابراہیمؑ کی خلّت، موسیٰؑ کی ہیبت، عیسیٰؑ کا زہد، اسمٰعیلؑ کا ایثار، ایوبؑ کا صبر، یوسفؑ کا حسن، تدبر یعقوبؑ کی جلالت، داؤدؑ کی قوت، ادریسؑ کی حکمت، خضرؑ کی رہنمائی، اور حضرت اسحٰقؑ کی بزرگیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدیؐ اپنے عروج و کمال پر تھے، خود حضرت نے فرمایا ہے:۔

"بیٹا حسنؑ! اگرچہ مجھے وہ عمر نہیں ملی جو لگلے زمانے والوں کو ملی تھی، مگر میں نے انکی سیرتوں کا جائزہ لیا، اُن کی تاریخوں پر غور کیا، اُن کے آثار کی تحقیق کی، یہاں تک کہ اب میں بھی ان میں کا ایک ہوں، بلکہ ان کے حالات سے اس قدر باخبر ہوں جیسے ان شخصیتوں میں سے ہر ایک کے ساتھ رہا ہوں۔"

(وصیت نامہ ۳۱ صفحہ ۴۲، نہج البلاغہ شرح و تہذیب حقیر طبع لاہور)

علیؑ ابنِ ابی طالبؑ مسلمانوں کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں، اِس فخر کے وجوہ میں سے

ایک علمی وجہ کا بیان اور حضرتؑ کے کمالاتِ علمیہ میں سے ایک اعجازی کارنامہ کا یہ ادبی مطالعہ آپ کے پیشِ نظر ہے، یہ کتاب بصیرت تو نہیں مگر ذوقِ بصیرت سے قریب ضرور ہے، اور دعا ہے کہ خدا ۔

"مرا ذوقِ بصیرت عام کر دے"

دعا گو

مرتضیٰ حسین

حضرت علیؑ کا عربی ادب پر احسان

ہر بڑا انقلاب ماضی کو گہرے غبار اور تاریک پردوں میں چھپا دیتا ہے، اور جب تک وہ انقلاب اپنے توانا نتائج کے ساتھ برقرار رہتا ہے اس وقت تک قوم، افراد، ماحول اور ثقافت میں تاثیر کی قوت و زندگی رہتی ہے، پھر یہ قوت نئی توانائیوں کا سرچشمہ بن کر نئے ادب، نئی تہذیب، نئے تصورات بلکہ نئی نسل پیدا کرتی ہے۔

تاریخِ عالم میں اسلام ایک حیات آفرین انقلاب تھا جس نے ماضی کو فراموش کرا دیا، مختلف قوموں کے بنائے ہوئے لات و ہبل توڑ دیئے، افراد کی انفرادی توانائی ماننے سے انکار کر دیا، لاقانونی کو فنا کر کے اس عہد کے کلچر، ثقافت، فرہنگ و تاثرات کو مہمل قرار دیا، ایک مضبوط قانون، معیاری کردار اور آسمانی خیالات، عقائد و ثقافت کی ترویج شروع کی، چنانچہ دس برس کے اندر اندر ماحول و ذہن بدل گئے۔ میلے ختم ہو گئے، چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیاں، قبائلی نظام اور رسم و رواج ختم کر دیئے، بڑے بڑے شاعروں، کاہنوں، خطیبوں، اور ادیبوں کو خاموش کر دیا، اس انقلاب کا آئین قرآنِ مجید تھا، اس انقلاب کا آسمانی زعیم آخری نبی محمدِ مصطفٰےؐ کا وجودِ ذیجود تھا، ہر ہوش مند صاحبِ عقل نے ان دونوں غیر معمولی معجزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، قصیدہ گو شعرا نے لنترانیاں چھوڑ دیں، قصیدے کے رنگ اکھڑ گئے، کاہنوں کی علاقائی و اشاراتی نثروں کے سننے اور یاد کرنے والے کم ہو گئے، مقرروں نے پیغمبرِ اکرمؐ کے سامنے بولنا چھوڑ دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جو روایتی ادب سکۂ رائج کی طرح

چل رہا تھا وہ ناپید ہوگیا، آج اِس اَدب کے محقق کو گنتی کے شاعر اور تھوڑے سے منتشر یا مشتبہ ادب کے علاوہ کچھ نہیں ملتا، اور پھر اس میں بھی نظم ہی نظم ہے، نثر برائے نام ہے۔

سنہ ۱ لبعثت سے سنہ ۱۱ھ تک جو ادب پیدا ہوا وہ قرآن و حدیث ہے، اِنقلابی تحریک یعنی اسلام کے پرستاروں نے ان دونوں چیزوں کے ہوتے ہوئے کسی اَدب کی ضرورت محسوس نہ کی یا کوئی ایسا موقع نہ پایا کہ خود بھی کچھ لکھتے یا بولتے، لڑائیوں میں البتہ رَجز خوانیاں تو ہوتی تھیں، لیکن خطبوں اور تقریروں کے مواقع یا تو تھے نہیں، یا کسی نے تقریر کی نہیں، کیوں کہ یہ ضرورتیں وحی یا صاحبِ وحی کے ہاتھوں انجام پاتی تھیں، نامور شعراء اپنے تجربوں کی بناء پر نئے ماحول میں اپنے اسلوب پر نئے خیالات بیان کرتے تھے، جن میں کوئی زیادہ تاثیر و کشش نہیں تھی، صرف یہ ہوتا تھا کہ وقتی تقاضے پورے ہوجاتے تھے۔

قرآنِ مجید اور اَحادیث کی نثر روزمرّہ کے معاملات میں کار آمد ہونے کے علاوہ اَدب کی اُن عظیم قدروں سے ہمکنار ہوتی تھی کہ لوگ شعر سے غافل ہوگئے تھے، ادھر قرآن نے اس تحریک کے زعیم کے لئے فرما دیا کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِىْ لَهٗ "ہم نے اپنے نبیؐ کو نہ شعر کی تعلیم دی نہ یہ فن اُن کے لئے مناسب ہے"۔ پھر اس ماحول کے شاعروں کے لئے کہا۔ اَلشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ "شعراء کے پیچھے رہنے والے گمراہ ہیں"۔ رسول اللہؐ نے اس تفسیر میں اس دَور کی شاعری کو بہت زیادہ قابلِ مذمّت بتایا۔ چنانچہ اَدب برائے اَدب اور اَدب برائے تفریح رُک گئی۔

سنہ ۱۱ھ کے بعد ایک تو وحی کا دَروازہ بند ہوگیا، دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے فرمودات کا تسلسل نہ رہا، اسلئے سرکاری کاروبار، عوامی ضروریات اور قانونی تفصیلات کے لئے نظم و نثر کی ضرورتیں مسلمانوں کی زبان و قلم سے پوری ہونے لگیں،

مگر نفسیاتی تاثیر اور قدرتی اثر کی وجہ سے ہر شخص قرآن اور حدیث کے اسلوب پر لکھنے اور بولنے کی کوشش کرتا ہوگا۔ ہمارے سامنے اس دور کا عربی مواد محفوظ طریقے پر نہیں پہنچا اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اس دور میں کوئی ادب جسے ادب کہا جا سکے پیدا ہی نہیں ہوا، میں جانتا ہوں کہ اس وقت خطوط نگاری، شاعری اور تقریر زندہ تھی، مگر ان چیزوں میں اتنی جان نہ تھی کہ مورخین و ادبا انھیں یاد رکھنے پر مجبور ہو جاتے، ادب جاہلیت کا چرچا تھا، مگر اسکے متوازی ادب پیدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ قرآن و حدیث کے نکات سمجھنے سمجھانے کے لئے اور بس۔

عین اس ذہنی افلاس اور ادبی جمود میں فرزند ابوطالب، پروردہ رسولؐ، مجاہد اوّل، داعیٔ انقلاب و اسلام کا قدیم ترین اور سب سے پہلا ساتھی علی ابن ابیطالبؑ شہر حکمت کا دروازہ، آیات قرآن کا حافظ اوّل، کلام خدا کا پُرخلوص جامع و مفسّر، احادیث نبوی کا پہلا مؤلف و مرتب، میدانوں کا رجز خواں، دعوت دین کا پہلا مبلّغ و مقرّر، مکّہ اور مدینہ میں آیات و فرامین نبیؐ بیان کرنے والا، دشمنوں کے سامنے سورۂ برأت اور دوستوں کے سامنے تفسیر و تشریح قرآن و حدیث کرنے والا نظم و نثر کے دریا بہا رہا تھا، اُس کی نظم روایتی شاعروں کیطرح مقامی قصّوں اور میدان جنگ کے جوش آفریں جذبات پر مشتمل نہ تھی، بلکہ اس میں ادب برائے زندگی کی روح تھی، اسلام کے مقصد کا پرچار تھا، خدائے بزرگ و برتر کی عظمت کا اعلان، دنیا اور اسلام کا رشتہ، اخلاق و مواعظ کا حکیمانہ تصوّر تھا، اسکی گفتگو قریش کی روایتی عظمت، قرآن و حدیث کی جلالت و شانِ اعجاز اپنے جلو میں لئے تھی، رزم میں رجز، غم میں مرثیے، عبرت خیز اشعار، نصیحت بخش قطعات، قدرے طویل مناجاتیں جوانی نظمیں حضرت علیؑ نے خود تحریر فرمائیں۔

مسندِ درس پر قرآن کی تفسیر، حدیث کی تشریح، احکام کی تفصیل بیان فرائی، کرسیٔ عدالت پر مقدموں کے فیصلے لکھے اور سنائے، بزم میں سنّت و سیرتِ نبیؐ کے واقعات بیان کئے، دوست اور دشمنوں کو خط لکھے، عہد نامے اور صلح نامے قلمبند فرمائے اور منبرِ رسولؐ اور پشتِ فرس، میدانِ رزم، مسجدِ عبادت میں تقریریں فرمائیں۔ غرض اپنی مصروف ترین زندگی میں وہ سب کچھ کیا جو حضرتِ محمدِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا کرتے تھے اور ہر بات میں وہ معیار پیش کیا کہ لوگوں نے کہا کہ "لو لا علی لهلك ......" اگر علیؑ نہ ہوتے تو... تباہ ہو جاتا۔" مَا انْتَفَعتُ بَعْدَ کَلَامِ رَسُولِ اللّٰہِ بِمِثْلِ هٰذَا الْكَلَامِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کلامِ امیرالمومنین سے زیادہ مجھے کسی بات سے فائدہ نہیں ہوا۔

تقریر و تحریر، نظم و نثر، تالیف و تصانیف، سیرت و کردار میں اتنی دلربائی، اتنی قدرت کشش کہ اسلوبِ قرآن پیشِ نظر رکھنے والے اصحاب و تابعین، کلامِ رسولؐ سننے والے کان اور دماغ اِن باتوں کو قلمبند، محفوظ اور نقل کرنے پر مجبور ہو گئے، کیوں کہ حضرتِ امیرؑ کا شعور، ذوق اور ادب انھیں معجزوں کا آئینہ دار تھا، وہی زبان، وہی خیال، وہی اسلوب، وہی انداز، اُسی رنگ کی عبارت، اُسی ڈھنگ کا مطلب، وہی بیباکانہ اعلانِ حقیقت، وہی آسمانی پیغام کا پرچار اپنے دامن میں لئے تھا جو آنحضرتؐ انھیں سکھا گئے تھے۔

مدینے کی تحریریں اور تقریریں لوگوں نے سنیں اور پڑھیں، فیضِ ہم نشینی، شرفِ ہم رکابی حاصل کیا، کوفے میں آئے تو یہاں کا ماحول مدینے سے مختلف تھا، یہاں کی ضرورتیں وہاں سے جداگانہ تھیں، وہاں گھر میں بیٹھ کے جانے بوجھے لوگوں میں گفتگو کرنا ہوتی تھی، مختصر مختصر تقریریں، چھوٹے چھوٹے خط، ایک ایک جملہ کا موعظہ ہوتا ہوگا، لوگوں کو بھولی

باتیں دُہرا کر پچھلی یاد یں دلاتے ہوں گے۔ منبر پر غیروں کا قبضہ تھا، میدانِ جنگ میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا، کچھ مُباحثے ہو گئے، کبھی کبھی بڑی تقریر کر دی ورنہ گھر میں بیٹھے درسِ قرآن وحدیث اور تبلیغ و تشریحِ احکام مشغلہ تھا۔

کوفہ میں مجمع نیا تھا، لوگ بالکل جاہل تھے، سپاہی ڈھل مل یقین، شہری غیر متمدّن، مسلمان ناواقفِ حقائقِ اسلام، سمجھ دار لوگ شام کی تہذیب و خیالات سے متأثر، صحابۂ رسول دنیا دار، واقف کار، ناواقف بن گئے۔ ادھر شامی ہنگامہ آرائی، معاویہ کی شعبدہ بازی، مخالفین کا پروپگنڈہ لوگوں کو گھبرا رہا تھا، جنابِ امیرؑ کو حقائقِ توحید، اُصولِ اسلام، فروعی احکام، تشریحِ مسائل، دشمنوں کے جوابات، دوستوں کی ہمّت افزائی، جنگی مسائل میں گفتگو اور عام خاص مجمعوں میں تقریریں کرنے کا زیادہ موقع ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ کوفہ علم و ادب، مسائل و توحید و اسلام، فلسفی اور نفسیاتی تقریروں کا دار العلوم بن گیا، اور ایسا شہر کہ جس میں مدینہ کے تئیس سالہ تاریخ کے پہلے کی طرح صرف ایک بولنے والا معصوم رہنما تھا۔ ۱۱ھ سے پہلے مدینہ میں صرف ایک زبان تھی، جسے محمدِ عربیؐ کہتے ہیں، اور ۳۵ھ کے بعد کوفہ میں صرف ایک بولنے والا علی مرتضیٰؑ کہلایا۔

مکّہ و مدینے کے اکابر ہوں یا کوفہ اور دمشق کے سر برآوردہ دونوں نے دیکھ لیا کہ علی ابن ابیطالبؑ کا لہجہ، لہجۂ نبوی اور اسلوبِ روحِ گفتگو آسمانی ہے، کوفہ تو خیر ایک نیا شہر تھا، دمشق جہاں امیر المومنینؑ کے دشمن جانی برسوں سے حکومت کر رہے تھے، جہاں دور دراز کے فکر و صاحبانِ سیف و قلم بڑی بڑی تنخواہوں پر بلائے گئے تھے وہاں بھی کوئی ایسا انشاء پرداز نہ تھا جو بیک وقت نظم و نثر کی ضرورت کو پورا کرتا، دربار کے کلرک دو دو معاون ادیبوں کے ساتھ بیٹھ کر خط لکھتے تھے، میدانوں کے اندر رکیک تازہ متکبّر زبان آور آتے تھے، تقریریں

کرتے تھے، مگر کیا؟ "نشستند و گفتند و برخاستند"

امیرالمومنینؑ تن تنہا نظم کا جواب نظم، نثر کا جواب نثر میں لکھتے تھے، تقریروں کا جواب تقریر سے دیتے تھے، اور اس شان سے کہ دوست اسے حفظ کرتے اور دشمن اسے لاجواب سمجھ کر دم بخود ہو جاتے تھے ۔

اُس دور کے خطوط آج بھی محفوظ ہیں، مگر ۳۶ھ سے آج تک کسی ادیب نے حضرت امیرؑ کے علاوہ کسی کی تحریر کو درخورِ توجہ نہ جانا، اور نہ کوئی تحریر ادبی سند اور ثقافتی دستاویز بن سکی۔ رہیں حریفوں کی تقریریں اور حضرت امیرؑ کے خطبے تو اُن کا مقابلہ تو مقابلہ کے موقع پر تذکرہ تک کرنا کور ذوقی کی علامت سمجھا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب کا سرچشمہ ہمہ گیر طبیعت، اور اتھاہ علم و حکمت، وجدان کا معیار اور نفسیات کا خلوص تھا، جہاں جذبات میں کھوٹ ہو، وہاں عبارت الجھ جاتی ہے، جہاں علم محدود ہو وہاں فن میں آفاقیت نصیب نہیں ہوتی، جب ادیب عبارت کی تکنیک اور مطالب کی سنجیدہ ترتیب سے ناواقف ہو تو قلم پارہ، ادب پارہ نہیں بننے پاتا ۔

کوئی ادیب یا ادب پارہ ادب کا سرمایہ اس وقت بنتا ہے جب وہ اپنے ماحول میں رہتے ہوئے عام انسانوں سے بلند اور پھیلے ہوئے ادب سے اونچا ہو، ادب پارہ حقیقت کا ایک پرتو ہوتا ہے، جسے ادیب سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ۔

دنیا کا ہر بڑا مفکر و پیامی انسان بڑا ادیب ہوا کرتا ہے، افلاطون، ارسطو، نطشے یا ہیگل، نصیرالدین طوسی یا بو علی سینا، فلسفیوں میں ادیب تھے، اور اگر گستاخی نہ ہو تو کہا جائے کہ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضور سرورِ عالم علیہم السلام خداوندِ عالم کے بعد ادب کے سرمایہ دار تھے، حضرت موسیٰ کی دعا تھی کہ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا

قَوْلِی" (قرآن) "خدایا! میری زبان کو اتنی روانی عطا فرما کہ لوگ میری بات کی روح تک پہنچ سکیں" جب کہ ادب کی تعریف بھی یہی کی گئی ہے۔ "ادب یک نوع ابلاغ یا انتقال فکری است کہ از ذہنے بذہن دیگر می شود" (سخن سنجی) از لطف علی صورتگر صفحہ ۱۶)

اور قرآن نے اپنے تعارف میں کہا ہے:۔

ھٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ" یہ کتاب اور اس کے مطالب عام لوگوں کے لئے توضیحات ہیں"۔ اور شاید پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ وَاِنَّ الْبَیَانَ لَسِحْرًا" بیان جادو آفرین چیز ہے"۔ ان جلیل الشان ہستیوں کے ملفوظات دو وجوہ سے ادب بنتے ہیں: ایک تو الہام و تائید خداوندی کی وجہ سے اور یہ بنیاد اس ادب کو تقدس و عظمت، دینی اعزاز اور عام ادب سے امتیاز بخشتی ہے، دوسرا ان حضرات کا خلوص جو اپنی بے مثالی کی وجہ سے دل کو موہ لیتا ہے، یہ خلوص ہر ادب کی جان ہے، جب تک ادیب میں خلوص نہ ہوگا، ادب میں زندگی نہ ہوگی، غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

"حسنِ فروغِ شمعِ سخن" دور ہے اسدؔ پہلے "دلِ گداختہ" پیدا کرے کوئی

یہ دلِ گداختہ دو طرح کا ہوتا ہے، ایک وقتی ہیجان اور آنی تأثر، جیسے شاعر کا دل یا شعلہ نفس مقرر کی طبیعت کا اشتعال، اسی گداخت یا انفعال سے پیدا شدہ ادب ہموار نہیں ہوتا، کوئی شعر نرم ہوتا ہے، کوئی گرم، کوئی تقریر بے مثال ہوتی ہے کوئی خطبہ بے جان، کوئی خطبہ دلکش ہوتا ہے کوئی قابلِ نظر انداز۔ ... لیکن جب تأثر فطرت کا جز گداختگی کسی مقصد آفرین وجہ سے ہو، ادیب کا ایک سوچا سمجھا پیام ہو تو اس میں ناہمواری کا نام و نشان نہیں آتا، ادیب جیسا خلوص رکھتا ہوگا، ادب اسی قدر با اثر اور دلکش ہوگا، خلاقِ حقیقت اور صاحبِ پیام اگر خود خداوندِ عالم ہے تو چونکہ اس کا خلوص نشیب و فراز سے ماورا ہے اسی لئے

اس کا کلام بھی اس قسم کے اختلاف سے کوسوں دور ہوگا، اس بات کو قرآن نے اپنے اعجاز کی دلیل بتایا ہے۔ " وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا " یہی کلام اگر خدا کے علاوہ کوئی اور کرتا تو تمھیں اس میں کافی اونچ نیچ اور ناہمواری نظر آتی۔ (قرآن)

یہ خلوص، یہ استواری نظر صرف اسی انسان کو ہوسکتی ہے جو خداوندِ عالم کیطرف سے اس کی مشیّت و حکمت، اس کے مقصد و ارادے سے باخبر کردیا گیا ہو، یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ کے ملفوظاتِ گرامی ادب کا پہلا سرمایہ بنے اور قرآن نے ساری عربی تاریخ و ادب کو متأثر کیا۔ ہر مسلمان نے اسے اپنی گفتار کا نصب العین اور کردار کا آئین بنایا، لیکن آسمان کی گردشیں حال کو ماضی بنا دیتی ہیں، واقعات کے زمانے اور فاصلے نتائج بدل دیتے ہیں، ادب کی اصطلاحیں اور زبان کے محاورات بھی اپنے معنی بدل لیتے ہیں، معیاری ادب کی برتری اسی وقت محفوظ رہ سکتی ہے جب اس کے الفاظ اور اشارات کو بحال رکھ کر اس کا ماحول نہ بگڑنے دیا جائے۔ تاریخ، تنقید، تفسیر و شرح کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ اصل ادب پارہ اپنے معانی، ماحول، کلام، اشارات، نزاکتِ ترکیب، حسنِ بیان اور انداز کے لحاظ سے واضح رہے۔ اگر قرآن تشنۂ تفسیر چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً اس کے ادبی اسلوب کو سمجھنے والے نہ رہتے، اس کے فلسفے اور مقاصد سے لوگ بے خبر ہوجاتے، رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بعد حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السّلام کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ آپ نے قرآنِ مجید کی تفسیر فرما کر مشکلاتِ قرآن کو آسان کر دیا، اور چونکہ علیؑ پہلے مفسّرِ قرآن ہیں اس لئے پہلے محسنِ ادبِ عربی ہیں ------- امیرالمومنینؑ نے قرآن کی تفسیر میں ایک معجزانہ مظاہرہ یہ بھی فرمایا کہ اسے واقعات کی کھتونی، فلسفہ کی جدلیاتی کتاب، لغت کی فنّی اور دورآفرینی کا منظر نہیں بنایا، بلکہ روح و مقصد کی ایسی

تفصیل پیش کی کہ صحابہ سے لے کر آج تک کے علماء اس کی تقلید سے عاجز رہے۔

علیؑ پہلے مفسرِ قرآن ہیں، اُن کی تفسیر حاشیہ نہیں بلکہ مستقل درس اور باقاعدہ تفسیر تھی جو بڑی حد تک آج بھی دفتروں میں محفوظ ہے ——— جب تک عربی ادب قرآن کے احسان سے زیر بار رہے گا، امیر المومنینؑ کا احسان بھی مانا جاتا رہے گا۔

امیر المومنینؑ کا شعور، روحِ محمدیؐ اور اخلاق سے اتنا متاثر تھا کہ لوگ حضرتؑ میں پیغمبرؐ کی تصویر، آنحضرتؐ کی زندگی اور اس معیار کا دل، خلوص اور مقصد دیکھتے تھے، اس عہد کے لوگ آپ کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے، تمام شخصیتوں میں صرف علیؑ تھے جو ببانگِ دہل فرماتے تھے۔ "اِنَّا لَاُمَرَاءُ الْکَلَامِ" ہم ہیں ادب کے امیر۔ (نہج البلاغہ)

اُن کا ہر نفس ذکرِ خدا سے آشنا، ان کی ہر ادا رنگِ اسلام سے رنگین، ان کا ہر عمل مقصدِ الٰہی سے ہم آہنگ تھا، چنانچہ وہ قرآن کو اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے، ان کا دل ہی نہیں شعور ولا شعور کا ہر حصہ حافظ و محافظِ قرآن تھا، اُنھوں نے دیکھا کہ عرب قرآن کو غلط پڑھنے لگے ہیں، اور لفظ کا غلط تلفظ، ترکیب سے ناواقف، اشارات و مطالب کو بدل دیتی ہے، مسلمان کچھ دن بعد اس معجزے کو اعجاز کے درجے سے گرا نہ دیں، اس لئے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور افرادِ ماحول سے فطری برتری اپنے خلوصِ دل گداختگی کی بنا پر بے چین ہو گئے اور ضبطِ اسلوب، معرفتِ ترکیب، لفظوں کے دروبست کی لطافتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قواعد کی تدوین فرمائی، اپنے صحابی اور شاگرد ابوالاسود دُئلی کو اصولِ علمِ نحو کی تعلیم دی اور فنِ نحو پر بنیادی اصول و مسائل لکھوا کر، گرائمر پر تقریر فرما کر عربی ادب فہمی کے مستقبل کو محفوظ فرما دیا۔

ظاہر ہے کہ کسی ادب کا محسنِ اعظم وہ ہے جو اس زبان کے قواعد و اصول مدوّن کر دے۔

امیر المومنینؑ کے احسانات کی نوعیت اصل میں دینی ہے، مگر ہمیں اس کا ادبی زاویۂ نگاہ

سے بھی جائزہ لینا ہے، اس لئے دونوں بیان کردہ احسان دینی طور پر جو عظمت رکھتے ہیں اسکے لئے اس سے زیادہ کچھ کہنا لفظوں کی بساط سے باہر ہے کہ

امیرالمومنینؑ خلیفۂ بلافصل رسولؐ، اور امامِ اُمّت ہیں، ان کا ہر قول وفعل دینِ خدا کے تحفظ کے لئے یکساں اہمیّت کا مالک ہے، وہ سرتاپا احسانِ عظیم تھے۔

ایک غیر شخص کے لئے جو ادبِ عرب کی عظمت کا قائل ہے، جس کے نزدیک عربی زبان ایک زندہ زبان ہے، جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عربی میں اتنی صلاحیت ہے کہ دنیا اسے اپنائے، اس کے لئے بھی یہ دونوں باتیں اتنی اہم ہیں کہ، اگر یہ اقدام نہ کیا جاتا تو عربی ادب تو کیا خود عربی زبان تک فنا ہو چکی ہوتی۔

علی ابنِ ابیطالبؑ وہ عظیم محسنِ عربی ہیں جن کی نگاہِ فیض اثر چشمۂ آبِ حیات کا کام کر گئی۔ حضرتؑ نے کوفہ اور بصرہ کی فوجی چھاؤنی میں رہنے والے عرب سپاہیوں، جاہل آوارہ گرد آدمیوں کو تعلیم اصول دے کر معلّمینِ ادب کا درجہ دیدیا، کوفہ و بصرہ کی آنے والی نسلوں کے لئے چراغِ ادب بن گئے، ادب کے تمام اصناف قرآن کی قرأت، قرآن کی عظمت اور اس کا ادب انھیں دو شہروں سے پھیلا، اور آج تک قواعدِ ادب، فصاحت و بلاغت اور اسالیبِ کلام نقد و لغت کے نکتے انھیں ماخذ سے ملتے ہیں۔

تفسیرِ قرآن و تدوینِ تعلیم و قواعدِ ادب کے علاوہ جناب امیرؑ نے ایک احسانِ عظیم یہ بھی فرمایا کہ جو کچھ لکھا، جب بھی بولے اس میں قرآن کو اپنایا، وہی لب و لہجہ، وہی اسلوبِ خیال، وہی زندگی کے حقائق، وہی اخلاق کی قدریں، وہی حقیقت آفرینی، وہی انسانی رجحانات، اور وہی آسمانی پیغام پیش کیا، جسے قرآن لایا تھا، یعنی کتابِ خدا کو اتنی بار دہرایا کہ سننے والوں کے مذاق اس کے علاوہ سب کچھ بھول گئے، ادب یا قرآن و حدیث یاد کی جاتی تھی، یا اشعار و

مکاتیب و خطب امیر المومنین علیہ السلام اگر کچھ پڑھا جاتا تھا تو قرآن و حدیث و آثار علیؑ۔ اگر کسی کو ادب پر کچھ لکھنا ہوتا تھا تو کتاب کا سب سے زیادہ اہم مواد انھیں تین چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

ادب کا قاعدہ ہے کہ کلاسیکل لٹریچر ادیبوں کے لئے مثالی نمونہ ہوتا ہے، کلاسیکس تالیف انشا پردازوں کے لئے رہنما ہوتی ہے، صاحبان ذوق ادیب و فن کار اس کی تقلید شروع کرتے ہیں، اگر ان کی تجرباتی کوشش کامیاب ہوگئی تو وہ اسلوب کم از کم ایک صدی تک زندہ رہتا ہے۔

عرب میں جہالت عام تھی اس لئے ترقی یافتہ ادب کی اُمید کم تھی، روایتی ادب اپنی عمر طبعی کو پہنچ گیا تھا کہ ایک معجزہ ہوا، اور آسمان سے قرآن نازل ہوا، شرکی اس پُراعجاز کتاب نے رہی سہی قوتِ ادب کو شل کردیا، لوگوں نے جب بھی اسے دیکھا، اس یقین میں پختہ سے پختہ تر ہوتے گئے کہ اسکے بعد ہماری کوشش رائیگاں ہوگی، اس لئے مزید کوشش بیکار ہے، امیر المومنینؑ نے اس اسلوب کو اپنا کر اتنی تقریریں اور تحریریں پیش کیں کہ لوگوں کو یہ راہ معلوم ہوگئی۔

قاعدہ ہے کہ متن کی شرح متن کی رُوح سے متعارف کرتی ہے۔ تصویر کے نقوش اگر مبہم ہوں تو اس کا حسن کچھ دن تک قابلِ توجہ رہنے کے بعد لوگوں کی نظر سے گرجاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی واقفِ فن اس کے ابہام کو دور کردے، رنگ اور خطوط کے اشارات کی توضیح کردے، انھیں رنگوں اور خطوط کی دوسری تصویریں بنادیں تو وہ اسلوب سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور اگر اس میں کوئی حسن ہے تو لوگ قابلِ تقلید سمجھ کر امتیازی مہارت ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ دنوں کے بعد وہی فن متعدد نمونے پیش کرنے کا سبب ہوتا ہے، صاحبانِ ذہن رسا اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھنے والے فنکار اسی راہ سے نئی نئی راہیں نکالتے ہیں، مگر ان سب کی انتہا ای پہلے موجد کی طرف ہوتی ہے، وہی اُن کا محسنِ اعظم کہلاتا ہے۔

ہمارے ادب میں غالب کی نظم، آزاد وشبلی کی نثر دیکھئے، مدت تک غالب کے اشعار فنی ابہام کی وجہ سے قابلِ تقلید نہیں تھے، مگر جب اس کا تجزیہ کیا گیا، تشریح کی گئی تو ہر چھوٹا بڑا اس اسلوب کو اپنانے لگا۔ آزاد و حالی کی نثر، شبلی اور نذیر احمد کا اسلوب شروع شروع میں حیران کن تھا، مگر جب خواجہ حسن نظامی اور عبدالحق وغیرہ نے اسے اپنایا تو وہی اسلوب مختلف اسکولوں کے لئے سنگِ میل ثابت ہوا، نئی نسلوں نے اس عظیم ادب کو اپنایا، اور اپنے ادب کو بے پناہ وسعتیں بخشیں، مگر یہ اقدام مثالی جرأت، غیر معمولی ذہانت و قابلیت چاہتا ہے، اس کے بعد ادب کی زندگی ان کے احسانات کی نمائندہ بن جاتی ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام وہ منفرد حکیم ہیں جنھوں نے عربی ادب میں اس تجربہ کی طرف قدم بڑھایا اور اس شان سے کہ یا تو ایک بھی قابلِ ذکر لکھنے اور بولنے والا عرب ادیب نظر نہ آتا تھا، یا یہ عالم ہو گیا کہ تاریخ میں ادیبوں کے نام اس قدر نظر آتے ہیں کہ ان کی فہرست بنانا ادب کا خود ایک شعبہ بن گیا، اب اسے فنی برتری کہئے یا معجزہ کہ ابنِ عباسؓ، سحبان وائل، ابنِ مزاحم، ابنِ عمید، صاحب بن عباد، جاحظ، ابن درید، خلیل، مبرّد، اصمعی، تو پیدا ہو گئے، مگر علی ابن ابی طالب بے مثال ہی رہے، یا یوں کہا جائے کہ امیر المومنینؑ کے بے مثال ادب نے بے مثال ادیب تو پیدا کئے مگر کوئی ادیب علیؑ کے ادب کا جواب پیش نہ کر سکا۔

آج تاریخِ ادب میں کاتبوں کے خطوط، مقرروں کی تقریریں تو ملتی ہیں، مگر "نہج البلاغہ" نہیں ملتی، انشا پردازوں کی بلاغت کے نمونے تو ملتے ہیں، مگر کسی کا ایسا بلاغت آفرین مجموعہ نہیں ملتا جسے دیکھ کر ایک عرب عالم ادیب بن جائے، مشہور عالم عبدالحمید،

ابنِ مقفع ، ابن نباتہ ، قاضی بن سلامہ (مؤلف دستور معالم الحکم۔ کلامِ امیر المومنین کا ایک قدیم مجموعہ جو ابتک کئی مرتبہ چھپ چکا ہے) مسعودی، جاحظ، غرض تمام قابلِ ذکر افراد نے اسے حرزِ جان و وردِ زبان بنایا اور ادب کے ستون اور عربی کے محسن بن گئے ، اور اپنے اس کسبِ فیض پر فخریہ انداز میں کہا کہ "حفظت سبعین خطبۃ من خطب الاصلع ففاضت ثم فاضت" میں نے علی ابن ابیطالب کے خطبوں میں سے صرف ستر خطبے یاد کئے تھے کہ ادب کے دریا بہنے لگے۔[۱]

یہ شرف آج تک صرف ادب امیر المومنین علیہ السلام کو حاصل ہے کہ قرآن کے بعد نثری و ادبی اسلوب بغیر کلام علیؑ کا مطالعہ کئے حاصل نہیں ہوتا۔

آج ساری دنیا متفق ہے کہ ڈرامہ، افسانہ، قصہ، غزل، قطعہ، مثنوی غرض کہ کوئی صنفِ ادب صحیح طور پر معیاری اُس وقت ہوتی ہے، جب اس سے زندگی کو فائدہ پہنچے، زبان کو وسعت حاصل ہو، ادب میں مواد کا اضافہ ہو، امیر المومنینؑ کا یہ بے مثال احسان ہے کہ حضرت نے عربی ادب میں سب سے پہلے ، اظہارِ بیان، فلسفہ و کلام، تاریخ، نفسیات، قومی اور انفرادی اصلاح ، اخلاقی اور ذہنی برتری کے مضامین کا بحرِ بے پایاں اور دفترِ طولانی کا ایک اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اس طریقہ کو خود ہی ایجاد کیا اور خود ہی ختم کردیا، اب جو بھی کہا جائے گا اسکی بدولت کہا جائے گا۔

اس وقت بڑے بڑے دعویدارانِ دین و ادب، مدعیانِ دعوتِ اسلام تھے، مگر بقول جاحظ (بنقل سید رضیؒ)۔

---

[۱] یہ جملہ عرب کے پہلے نامور ادیب عبدالحمید بن یحییٰ متوفی ۱۳۲ھ کا ہے جسے کئی ادیبوں نے اپنے لئے دہرایا ہے۔

هٰذه الخطبة ربما نسبها من لا علم له إلى معاوية، وهي من كلام امير المؤمنين الذي لا يشك فيه. واين الذهب من الرّغام والعذب من الاجاج ؟

اس ۱۳۱ ویں خطبے کو چند ناواقف لوگوں نے معاویہ کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن یہ بلاشبہ امیر المومنینؑ کا کلام ہے، بھلا کہاں خالص سونا، کہاں مٹی، کجا آبِ شیریں، کہاں کھاری پانی، لوگوں کے اس خیال کی تردید و تنقید تو ماہر ادب، اور پرانے اداشناس نقّاد جاحظ نے بھی کی ہے، اس نے اپنی کتاب "البیان والتبیین" میں ان لوگوں کی رائے لکھنے کے بعد لکھا ہے۔

وقد دلّ على ذلك، الدليل الخرّيت ونقدّه الناقد البصير، عمرو بن بحر الجاحظ فانه ذكر هذه الخطبة في "كتاب البيان والتبيين" وذكر من نسبها الى معاوية ثم قال۔

هي بكلام علىّ عليه السّلام اشبه وبمذهبه في تصنيف النّاس وبالاخبار عمّا هم عليه من القهر والاذلال ومن التّقيّة والخوف اليق۔

یہ گفتگو امیر المومنین کے کلام سے بیحد مشابہ اور سبھی عوام کے نفسیات اور رجحانات کے اظہار کا وہی اسلوب ہے لوگوں میں یاسیت، احساسِ کمتری، بچنے کی کوشش اور خوف کی وضاحت اسی رنگ و انداز سے تعلق رکھتی ہے۔

قال:۔ ومتى وجدنا معاوية في حال من الاحوال يسلك كلامه مسلك الزهاد، ومذاهب العباد ؟

پھر لکھا ہے:۔

اور ہم نے معاویہ کی کوئی ایسی حالت و کیفیت نہیں دیکھی، جب وہ زاہد و عابدوں کے مسلک پر چلے ہوں۔

(نہج طبع مصر۔ حاشیہ محی الدّین۔ جلد ۱ صفحہ ۶)

امیر المومنینؑ نے دل و دماغ وضع کئے، اسلوب و آہنگ پیدا کئے، لفظوں اور معنوں کا

اِستعمال، اِستعمال کو مواقع عطا کیے، ان سے پہلے کوئی ادیب ایسا نہیں گذرا جس کی بزمیہ تقریر سن کر کوئی بے ہوش ہوا ہو، حضرتؑ نے وہ انداز پیش کیا جسے سُن کر ادیب کا تقاضا ہوا کہ "یا علیؑ یہ تقریر جاری رکھیے" ان سے پہلے کسی نے اپنے آپ کو "اِنّا لَاُمَرَاءُ الکلام" نہیں کہا۔ حضرتؑ کے اُدبی احسانات میں فقط ذہن و زبان کی محیّر العقول پیش کشوں، اسالیب، عناوین کی معیاری تحریروں یا تقریروں، شعروں یا حکیمانہ جملوں کا عظیم الشان مجموعہ ہی نہیں، بلکہ حضرت نے حسنِ ادا، معراجِ ترکیب، خوبیٔ گفتار، بلندیٔ مطالب، استفادہ و اقتباس قرآن کی بے مثال ندرتوں اور مرصع کاریوں کے علاوہ جہانِ زبان و اُدب کی قدریں معین فرما کر عربی اَدب کو زندگی بخشی، وہاں نقد و انتقاد کی راہ کھولی، آپ نے فرمایا۔

وَاَنّ الاُمُورَ اِذَا اشْتَبَهَت اِعتُبِرَ بِاَوّلِهَا۔ یہ اصول یاد رہے کہ جب کسی معاملے میں حقیقت مشتبہ ہو تو آغازِ عمل و ابتدا کو یاد رکھو۔

اَدب میں پس منظر سے واقفیت، فنی جائزہ اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی یہ پہلی شرط ہے۔ جسے حضرت نے اہمیت کے ساتھ سب سے پہلے بطور اصول ہمیں سمجھایا ہے۔ یا حضرتؑ کا ارشاد کہ:-

قِیمَۃُ الْمَرْءِ مَا یُحْسِنُہٗ [۱] ہر شخص کا شاہکار ہی اس کی قیمت ہے۔

یہ باتیں تخمینی اور خیالی طور پر نہیں لکھی جا رہی ہیں بلکہ نہج البلاغہ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ان ادبی حقیقتوں کو مناسب موقعوں پر بتاتے رہتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ اپنے کاتب عبید اللہ بن ابی رافع سے فرمایا تھا۔

---

[۱] سید رضی نے لکھا ہے کہ نہ اس حکیمانہ جملے کی کوئی قیمت معین کی جا سکتی ہے نہ کوئی حکیمانہ کلام اس کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہے۔ ابن خلدون نے تو اپنے مقدمہ کی کتاب اول، فصل ۱۹۷ میں کافی فلسفیانہ بحث کی ہے۔ دیکھیے ہماری شرح مقدمہ ابنِ خلدون جو مکمل ہو کر منتظرِ اشاعت پڑی ہے۔ (مرتضیٰ)

اَلِقْ دَوَاتَكَ، وَاَطِلْ جِلْفَةَ قَلَمِكَ، وَفَرِّجْ بَيْنَ السُّطُوْرِ، وَقَرْمِطْ بَيْنَ الْحُرُوْفِ ـ فَاِنَّ ذٰلِكَ اَجْدَرُ بِصَبَاحَةِ الْخَطِّ ـ

(نہج، کلمہ ۳۰۸، طبع لاہور)

دوات صاف رکھا کرو، قلم کی زبان ذرا بڑی ہونا چاہئے، سطروں میں فاصلہ کا خیال رہے، حروف کے جوڑ موزوں طریقہ سے ملانا چاہئے (حرف کٹے کٹے نہ ہوں) کیونکہ ان باتوں سے خط میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

ہمارے زمانہ میں جب کہ اَدبی شعور اپنے شباب پر ہے، فن کار اَدیب اپنی تحریر کے لئے دیدہ زیب کتابت و طباعت کے قائل ہیں، یہ مانا جاچکا ہے کہ اَدب کے اشارات، فن کے نکتے اُس وقت تک تشنۂ اظہار رہتے ہیں، جب تک بیان کے وقت تلفظ، لہجہ، انداز بیان میں توضیحی علامتیں نہ ہوں، اسی طرح تحریر میں اگر معیّنہ علامتیں استعمال نہ ہوں تو اَدبی لطافتیں دب جاتی ہیں، ناظر و قاری اَدیب کی ذہنی کیفیت اور اَدب کی لطافتوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا، اِس تجربہ اور تجزیہ کی روشنی میں امیرالمومنین علیہ السّلام کا یہ ارشاد دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرتؑ نے عام اَدب پر عموماً اور عربی اَدب پر خصوصاً کتنا بڑا احسان فرمایا ہے۔ اِس جذبۂ معرفت آموزی و بصیرت پاشی کا اثر تھا کہ حضرتؑ ادیبوں کی جماعتیں دیکھنا چاہتے تھے، آپ نے نئی نسلوں کو پیغام دیا ہے کہ :- تَكَلَّمُوْا تُعْرَفُوْا فَاِنَّ الْمَرْءَ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِهٖ ـ بولنا سیکھو اور بولا کرو، لوگ تمھاری قدر و قیمت معلوم کرسکیں گے، کیونکہ انسان زبان کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ مولانا سعدیؔ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز

کلامِ علیؑ

کا

عربی ادب پر اثر

کسی مسئلہ کی تاثیر یا تاثر معلوم کرنے کے لئے موضوعِ بحث کو "تجریدی" حالت میں دیکھنا تقریباً ناممکن ہوا کرتا ہے، اس لئے موضوع کا پس منظر اور اسکے مستقبل کا جائزہ لے کر فیصلہ آسان اور تعارف واضح ہو جاتا ہے۔

بحث یہ ہے کہ "عربی ادب" پر "کلام علیؑ" کا "اثر" ہوا یا نہیں؟ اور ادب میں وہ کون سی خصوصیتیں پیدا ہوئیں جن سے یہ معلوم ہو کہ "کلامِ علیؑ" نے ادب کو متاثر کیا؟ مشکل یہ ہے کہ "عہدِ تہذیب تاریخ"[1] سے پہلے کسی خاص چیز کا پس منظر معلوم کرنا "کھدائی" اور زمین میں معدنیات کی تلاش سے کم نہیں۔

ادبِ جاہلیت

البتہ کلام علیؑ کا پس منظر سمجھنے کے لئے "ادب قبل از اسلام" کا مطالعہ کرنا ضروری ہے، یہ مطالعہ اگرچہ کافی طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے کہ "ادب قبل از اسلام" جسے ادب جاہلیت

---

[1] میں تاریخ کے تینوں عہدوں کو، عہدِ قصص، عہدِ تدوین، عہدِ تہذیب کہتا ہوں۔

کہتے ہیں ایک جاندار، زندہ، اور تاریخی ادب ہے، اس کے دامن میں تیز و تند ہوائیں، زلزلے کی آندھیاں، چٹیل میدان، اطلال و دمن، اونچی نیچی پہاڑیوں پر آگ کی شعلہ فشانی، یا کبھی کسی آبادی کے کھنڈر اور رزمگاہوں میں تلواروں کی چمک نظر آتی ہے، اس میں چلتے پھرتے قبیلوں کا نظام معاشرت، شہریوں کا اندازِ زندگی، قبائل کی خانہ جنگیاں، افراد کے ذہنی، اخلاقی اور فکر کے سطحی اور رنگین مرقعے نظر آتے ہیں۔

شخصی و اجتماعی کردار، قومی اور قبائلی دستور اگر تلاش کرنا ہوں تو ادب جاہلیت بے مثال دستاویز ہے، سادگی، شجاعت، حریت اور جنگجوئی کے جذبات کا یہ دفتر فصاحت آفریں حیرت انگیز حد تک متاثر کن ہے، لیکن وہ عرب جو شعر کو سجدہ گاہ جانتا تھا جس نے بنی تغلب کو ہر حکومت و برتری بھلادی تھی جو اپنے شاعر کے شعر کا رکو "جاددان" اس قدر ادب پرستی کے بعد بھی اس کے لٹریچر میں ایک خلا ہے، اور وہ ہے "نثر" کا فقدان، مورخین ... اور آثارِ ادب میں قصے، لمبی کہانیوں، یا مذہبی نثر کا نام نہیں، بلکہ وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ بازاروں میں اگر ایک طرف شاعر اپنے قصیدے، غزلیں، ترانے اور "شاہ نامے" سناتا تھا تو دوسری طرف ان کے شعلہ بیان خطیب تقریریں کرتے تھے، یہ تقریریں رزم میں برجستہ، رواں انقلاب آفریں و فخریہ تھیں، اور بزم میں مسرت خیز و فخر آمیز و مسجع عبارت، اہتمامی انداز اور باقاعدگی و سنجیدگی سے بھاری، مگر یہ دونوں نثریں بنیادی خیال، موضوعی فکر اور مقصدِ انشاء سے خالی تھیں، خطیب محنت کرتا تھا اور داد حاصل کرکے فنی کمال کا مظاہرہ کرتا تھا، قلقشندی کا بیان ہے کہ۔

واعلم انہ کان للعرب الخطب والنثر غایۃ الاعتناء حتی قال صاحب "ریحان والریعان" ان ماتکلمت	عرب تقریروں اور نثر پر پوری توجہ دیتے تھے، صاحب "الریحان والریعان" کے بقول، شہری اور بادیہ نشین عربوں نے اعلیٰ درجہ

به العرب من اهل المدر، والوبر من جيّد المنثور ومزدوج الكلام اكثر مما نكلمت به من الموزون عشره، ولاضاع من الموزون عُشره (صبح اعشى ۲۱۱/۱)	اور معیاری مرتبہ کی نثر، نظم سے زیادہ استعمال کی، مگر نثر کا دسواں حصّہ بھی محفوظ اور نثر کا دسواں حصّہ بھی ضائع نہ ہوسکا۔

یہ خطیب دو طرح کی تقریریں کرتے تھے، تمہیدی اور غیر تمہیدی تقریریں "بترا" کہلاتی تھیں، پھر یہ خطبے دو طرح سے پیش کئے جاتے تھے "کھڑے ہو کر بولنے والے"، جاحظ نے ان لوگوں کے بارے میں بڑے معلومات فراہم کئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ کھڑے ہو کر بولنے والے مقرّر، سیاسی و معاشرتی موقعوں پر کھڑے ہو کر بولتے تھے، اور فقط نکاح کا خطبہ بیٹھ کر ادا کیا جاتا تھا۔ اسٹیج کے خطبوں کا انداز یہ ہوتا تھا کہ :۔

وكان لكلّ قبيلةٍ خطيب كما كان لكلّ قبيلة شاعر۔	جس طرح ہر قبیلے کا ایک شاعر ہوا کرتا تھا اسی طرح ہر قبیلے کا ایک خطیب بھی تھا۔
واكثر ما كانت الخطابة في التحريض على القتال والتحكيم في الخصومات واصلاح ذات البين. وفي المفاخرات والمنافرات والوصايا وغير ذالك ۔	اکثر جنگی تحریک یا آپس کے جھگڑوں میں فیصلے، صلح صفائی، فخریہ و ہجویہ یا وصیت ونصیحت وغیرہ کے موقعوں پر یہ لوگ بولتے تھے،
وكان من عادة الخطيب في غير خطب الاملاك والتزويج ان يخطب قائما او على نشز ومرتفع من الارض وعلى ظهر راحلته لا بعاد مدى الصوت والتاثير	کسی چیز کے خریدنے، یا عقد نکاح کے علاوہ "خطیب" کھڑے ہو کر بولتے تھے، یہ اسٹیج یا تو کوئی چبوترہ، ٹیلا، ہوتا تھا۔ یا اونٹ کی پیٹھ پر سے یہ کام لیتے تھے۔

بشخصہ، واظہار ملامح وجہہ وحرکات جوارحہ، ولاغنی لہ عن لوث وعصب العمامۃ والاعتماد علی مخصرۃ اوعصی اوقناۃ اوقوس۔	مقصد یہ تھا کہ آواز دور تک پہنچے، شخصیت سے مرعوب کیا جائے، چہرے کے اتار چڑھاؤ دکھائے جائیں۔
وربما اشار باحد اجہا او بیدہ۔ (جواہر الادب ج۲)	اس کے علاوہ کچھ اور بھی کیا جاتا تھا، مثلاً عمامہ باندھتے تھے، چھڑی، نیزہ یا کمان ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اور کبھی چشم وابرو دہاتھ سے اشارہ بھی کرتے تھے۔

اُس دور کے بڑے بڑے بولنے والے خطیبوں میں چند افراد یہ ہیں:۔

(۱) قیس بن خارجہ (م ۶۰۰ء تقریباً) یہ شخص نجران کا لاٹ پادری، حکیم ومبلغ کے علاوہ جنگ داحس وغبرا کا خطیب مانا گیا ہے۔

(۲) خویلد بن عمرو غطفانی، جنگ فجار کا مقرر۔ "عکاظ"

(۳) قیس بن ساعدہ، عرب کے مشہور بازار اور عظیم الشان میلے "عکاظ"، کا خطیب جس کا ایک خطبہ رسالتمآب نے بھی سنا تھا اور حضرت ہی کی روایت نے اس کے ایک خطبے کو محفوظ فرمایا۔[۱] (الصبح الاعشیٰ۔ ج ا، صفحہ ۲۱۲)

(۴) اکثم بن صیفی جو نعمان بن منذر کی طرف سے دربار کسریٰ میں جانے والے وفد کا صدر تھا۔

(۵) ابو ثور عمرو بن معدیکرب الزبیدی، جو اندازاً ۵۲۳ء میں پیدا اور ۶۴۳ء میں مرا ہے۔ یہ یمن کا بہادر، عرب کا خطیب اور غضب کا ادیب تھا۔ ۹ھ میں مسلمان ہو کر مرتد ہوا پھر اسلام لایا اور مسلمان مرا۔ (تاریخ ادب العرب احمد حسن زیات ص ۱۷۴۔ المجلد ۲)

(۶) یونس بن حبیب، جسے ابن رشیق "غلاّبا فی الخطب" فن تقریر کا شیر کہتا ہے۔

---

(۱) اصل میں "احداھا" ہے، قلقشندی کا بیان ہے کہ معاویہ ضخامت بدن کی وجہ سے بیٹھ کر تقریر کرتے تھے۔

(کتاب العمدہ ج ۱ ص ۶۵)

(۸،۷) ان کے علاوہ قریش کے آتش نفس مقررین میں جناب رسالتمآب و امیرالمومنین کے جدِ ہفتم کعب بن لوی" ہیں۔ سیّد احمد ہاشمی لکھتے ہیں:۔

مِنْ اَقدمھم" کعب بن لوی" وکان	ان خطیبوں میں قدیم ترین بزرگ کعب بن لوی
ذالفوذِ عظیم فی قومہ حتی	ہیں جو اپنی قوم میں بڑے صاحبِ اثر واقتدار تھے۔
اکبروا موتہ۔ (جواہرالادب ج ۲ ص ۱۹)	حتے کہ ان کی موت کو بڑی اہمیت[۱] دی گئی۔

قلقشندی کا بیان ہے کہ اس عہد میں عرب نے فن خطابت میں اچھی خاصی ترقی کر لی تھی، مگر وہ سرمایہ ضائع ہو گیا، قیس کا خطبہ آنحضرتؐ کی توجہ اور کعب کا خطبہ ان کی جلالت کے ہاتھوں بچ گیا، یا پھر حضرت ابوطالب (پدرِ جناب امیرؑ و مربی جناب رسالتمآبؐ) کا وہ خطبہ محفوظ ہے جو آپ نے عقدِ جناب خدیجہؓ کے موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا۔

الحمد للہ الذی جعلنا من ذریۃ[۲]	اس خدا کا شکر جس نے ہم کو ذریتِ ابراہیمؑ
ابراھیم وزرع اسماعیل وضئضئی	وکشتِ اسماعیل پشت معد اور نسل مضر میں
معد وعنصر مُضر۔ وجعل لنا بیتاً	خلق کیا، اپنا مرکز حج (خانۂ کعبہ) اور امن کا
محجوجا وحرمًا آمنا وجعلنا آمنا بیتہ	حرم ہمیں عطا فرما کر اس کا امین اور محافظ
وسوّاس حرمہ وجعلنا حکّاماعلی الناس۔	قرار دے کر لوگوں پر حکومت کا حق دیا۔
ذانّ ابن اخی۔ محمّد بن عبد اللہ۔	میرے بھائی کا فرزند محمّد۔۔۔ وہ ہے
من قد علمتم قرابتہ، وھولا یوزن	جس سے میرے تعلق کو آپ سب جانتے ہیں۔

---

[۱] ان کی تقریر کے لئے ملاحظہ ہو الصبح الاعشےٰ ج ۱ ص ۲۱۱ بحوالہ کتاب الاوائل، ابوہلال عسکری۔

[۲] زرع ابراھیم وذریۃ اسمٰعیل۔ الصبح الاعشےٰ ۲/۱۳ المجمل ۲/۲ (سہ کیلئے ۳ دیکھئے)

به احداً الّا رجح به، فان كان في المال قلّ، فان المال ظلّ زائل۔ وقد خطب خديجة بنت خويلد وبذل لها من الصّداق ما عاجله وآجله من مالي كذا وكذا وهو والله بعد هذا له نبأٌ عظيم وخطر جليل۔ (كتاب التاريخ اللغة العربية ۲/۷۵)

یہ وہ شخص ہے کہ اس کے مقابلے میں جسے بھی تولو گے جھکا ملے گا، اگرچہ مال کم ہے لیکن دولت تو ڈھلتا سایہ اور چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اس فرزند نے خدیجہ بنت خویلد سے نکاح کرنا چاہا ہے، اتنی رقم فوری اور تاخیر کی ادائیگی میرے مال سے ہو رہی ہے۔ خدا کی قسم اس عظیم الشان انسان کے متعلق بڑی بڑی پیشین گوئیاں اور عظمتیں ہیں۔

خطبے لبد کے ادیبوں نے جستہ جستہ محفوظ تو کئے لیکن نہ اُن کی روایت مسلسل ہے نہ ترتیب، پھر ان کی مقدار و نوعیت بھی قابلِ اہمیت نہیں، نہ عوام نے اس سے دلچسپی ظاہر کی نہ خطیبوں نے راوی رکھے، لوگوں نے بات سنی اور بہت پسند کیا تو ایک آدھ جملہ اپنا لیا، علم تھا نہیں، تحریر جانتے نہ تھے، خشک و طویل عبارتیں حافظے میں کیسے رہ سکتی تھیں، پھر مقابلہ تھا ہنگامہ آفرین قصیدوں، جوش آور رجزوں اور ولولہ انگیز و نصیحت خیز نظموں سے، لہٰذا یہ لے دب گئے اور تنقید و تاریخ کے ماہرین نے صرف یہ کہہ کر قلم روک لیا کہ "یہ ادب مقفّٰی مسجّع، سادہ و غیر مسلسل، ادب اور رنگارنگ اسلوب رکھتا ہے جس میں اخلاق زیادہ اور علم کم ہے۔"

ل ... ثمّ ان محمّد بن عبدالله ابن اخي من لا يوزن به فتى من قريش الّا رجح به برًّا وفضلًا وعدلًا ومجدًا ونبلًا۔ وان كان في المال قلّ، فانّ المال عارية مسترجعة وظلّ زائل، وله في خديجة بنت خويلد رغبة ولها فيه مثل ذالك وما اردتم من الصّداق فعلي۔ (المجمل ص۲۷۔ ج۱)

چھوٹے چھوٹے جملے اور ضرب الامثال

انھیں ادیبوں نثّاروں اور خطیبوں کے جملے "کلماتِ قصار" اور حکمت خیز ضرب المثل اور کہاوت کے طور پر رائج ہوئے اور عربی ادب کا سرمایۂ نثر بنے۔ یہ جملے کبھی مکالموں کا جز، وصیتوں کے ٹکڑے تھے، کبھی ترکیب و فن کے نادر نمونے، درحقیقت ان کا کوئی علیحدہ وجود نہ تھا۔

جاحظ کہتا ہے کہ "یونان و ہندوستان و ایران کے مقابلے میں عربوں کا امتیاز شعر میں نہیں خطبوں میں ہے کہ ان ملکوں میں مقرّرین کا سراغ نہیں ملتا، البتہ حکیمانہ جملے اور فلسفیانہ گفتگوئیں ان کے یہاں بھی کم نہیں"۔ لیکن ادبِ جاہلیت کے وہ خطبے نہ ہونے کی بناء پر اُن کے یہی جملے کانِ بلاغت اور جانِ فصاحت بن گئے۔ زمخشری کہتا ہے۔

اہلِ زبان عربوں کی ادبیت

قصاریٰ فصاحۃ العرب العرباء، جوامع کلمھا، ونوادر حکمھا وبیضۃ منطقھا وزبدۃ بلاغتھا التی اعربت عن القرائح السلیمۃ، والرکن البدیع الی ذرابۃ اللسان وغرابۃ اللسن حیث اوجزت اللفظ فاشبعت المعنی وقصرت العبارۃ فاطالت المغزی،،

(کتاب تاریخ الادب العربیہ ص ۲۳۰)

اہلِ زبان عربوں کی ادبیت کی انتہا ان کے جامع ترین کلمات، حکیمانہ نکتے، گفتگو کے جواہر پارے اور بلاغت کی روح وہ کلام ہے جو اہلِ ذوق طبیعتوں کی ایجاد اور آتش نفس مقرروں کی تیزیٔ زبان و ندرت سے ترشے ہوئے جملوں کی شکل میں نظر آتا ہے۔

یہ جملے مسجّع بھی ہیں اور قدرے مختصر بھی، اخلاقی بھی ہیں اور ادبی و فلسفی بھی۔ مثلاً

(۱) البس لکل حالة لبوسها۔ اما نعیمها واما بؤسها۔
خوش حالی ہو یا پریشانی، ہر حال میں ویسے ہی رنگ جاؤ۔

(۲) ثار حابلهم علی نابلهم۔
ان کا نہتا ہتھیار پر جا پڑا۔

(۳) الیوم خمر وغداً امر۔
آج عشرتیں اور کل فیصلہ۔

(۴) انّ البغاث بارضنا یستنسر
ہمارے علاقہ میں مردار خوار بھی شاہین بن جاتے ہیں۔

(۵) ان کنت ریحاً فقد لاقیت اعصاراً۔
اور ہوا کی طرح نرم وسبک رفتار ہو تو بڑی دُنیا ہوگی۔

(٦) حسبك من القلادة ما احاط بالعنق ما احاط بالقلادة۔
گلوبند کے لئے اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ وہ گلوبند ہے۔

اِس سارے جائزے کا خلاصہ یہ ہے :-

الکلام الذی یقعد منه تصویر المعانی النفیسه والاجتماعیة، وفیه مظهر من قوی العقل والتفکیر۔
میرا خیال ہے کہ عرب جاہلیت کے پاس اس قسم کا نثری لٹریچر موجود نہیں کیونکہ اس طرح کا ادب تمدّن کا پھیلاؤ اور ضروریات تہذیبی مکمل ہوں۔

ولا احسب انّ العرب الجاهلیة من هذا النوع لان النثر بهذا المعنی لا یظهر ولا ینضج الاّ حیث تکون محضارة وارفة الظلال کاملة الاسباب تدعوا حالتها الطبیعیّة الی تنظیم الجماعات
اس زمانے میں فطری طور پر جماعتوں میں تنظیم، نظام میں آہنگی اور حکیمانہ آئین جاری ہوتے ہیں، تحریر یا تالیف کا ظہور اسی وقت ہوتا ہے۔

وضبط الظلمتها وشئونها بقيود العقل التي يسمونها الكتابة او التدوين۔	آج کا ادیب جب دورِ جاہلیت کی نثر پر گفتگو کرتا ہے تو کم وبیش چار چیزیں ملتی ہیں۔
واذا عددنا لهم نثرا فانما هو:	
(أ) حديث يدور بينهم في شئون المعيشة۔	(۱) وہ باتیں جن کا تعلق روزمرّہ زندگی سے ہے۔
(ب) او جمل قصيرة تتضمّن حكمة او مثلا سائرا، لحكيم من الحكماء	(۲) فلسفہ آمیز جملے، یا کسی حکیم کی زبان سے نکلی ہوئی کہاوتیں۔
(ج) أو كلام يقوم به نابه مشافهة الملوك وفي الاصلاح بين القبائل او الحضّ على القتال، او في التفاخر والتنافر۔	(۳) بادشاہوں سے مکالمے، قبائلی اصلاح، جنگی تحریک یا فخریہ وہجویہ تقریریں۔
وليس في هذا كله شئ من مظاهر الفنّ الذي نجده في شعرهم۔ (المجمل ج ۱۔ ص ۱۵)	لیکن اس ذخیرہ میں ہمیں کوئی ایسی فنی روشنی نہیں ملتی جو ان کے شعری ادب کی طرح عام ہو۔

شعری اَدب

ابن سلام جمحی نے خوب کہا ہے کہ:۔

عربوں کا شعری ادب " دِيْوَانُ عِلْمِهِمْ وَمُنْتَهٰى حِكْمَتِهِمْ بِهٖ يَأْخُذُوْنَ وَاِلَيْهِ يَصِيْرُوْنَ "۔ عربوں کے علم کا دفتر، ان کے فلسفہ کی معراج ہے، یہی ان کی ابتداء اور

یہی انتہا۔

• اَدب جاہلیت کے محسن عظم ابو تمام (م ۲۳۱ھ) نے اس دفتر کو "نو بابوں"[۱] پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) حماسہ (فخریہ و بہادرانہ و طربیہ شاعری)

(۲) مراثی (المیہ شاعری)

(۳) نسیب (غزل)

(۴) الاضیاف والمدائح ۔ (اَخلاقی شاعری)

(۵) باب الصفات ۔ (بیانیہ شاعری)

(۶) السیر والنعاس (سفری حالات، عوامی گیت)

(۷) باب مذمۃ النسآء (عورت)

اِس تاریخی پس منظر میں اِسلامی اَدب

اِسلام کی آواز دعوتِ اَدب کے اِس غیر واضح اور اُلجھے ہوئے پس منظر سے اٹھی، اس دعوت میں وحدتِ فکر، پیام، علم و عمل کی طرف للکار تھی، اس کے ادبی ذخیرے میں تشکیل کردار، اِصلاحِ معاشرہ کا فلسفہ و بیان تھا، عرب کی قدیمی خانہ جنگیاں ختم ہوگئیں، قصیدوں کا عروج یوں ختم ہوا کہ خانۂ کعبہ کے اندر لٹکے ہوئے قصیدے اتر گئے، فخر و ہجو کے اِجتماعات کی اَہمیّت باقی نہ رہی، قرآن ایک واضح راستہ، روشن منارہ اَور مثالی اَدب و زبان لے کر آیا، قریش کی زبان، سادگی بیان، مطالب کی گہرائی، اصلاحِ اخلاق کی

---

[۱] محمد بہجۃ الاثری نے "المجمل فی تاریخ الادب العربی" میں ان ابواب کی فہرست یوں لکھی ہے، ادب حکمت، فخر، حماسہ، وصف، غزل، نسیب، مدیح، رثا، ہجا، عتاب، اعتذار۔ (ص ۴۸ - ۵۲)

۱

گیرائی اور اعجاز کی بلندیوں نے آفاق کے ذہن و دماغ، زبانوں اور قلموں کے انداز بدل دیئے، قرآن نے نثر کا اعجازی اسلوب پیش کر کے خطیبوں کو اہمیت دی، شاعروں کے مقابلے میں مقرر، میلوں کے مقابلہ مسجدوں کے صاف ستھرے اجتماعات پسند کئے اس دعوت کا نقیب، اور دین کا زعیم اپنے ماضی کے کردار اور حال کی عظمت کو جلو میں لئے ہوئے ختم نبوت کے منصب دار کی حیثیت سے جب بھی بولا، جو بھی پیغام دیا اس کے لئے نثر ہی کو تجویز فرمایا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک کے تاثر سے عربی ادب مالا مال اور خطیب کے خطبے ممتاز ہو گئے۔ قلقشندی کہتا ہے :۔

- قال ابو جعفر النّحاس :۔

وهي آكد ما يحتاج اليه الكاتب، وذلك

- ان الخطب من مستودعات سرّ البلاغة ومجامع الحكم، بها تفاخرت العرب في مشاهدهم، وبها نطقت الخلفاء والامراء على منابرهم بها يتميز الكلام، وبها يخاطب الخاص والعام وعلى منوال الخطابة نسجت الكتابة وعلى طريق الخطباء مشت الكتّاب

انشاء پرداز کے لئے سب سے ضروری یہ ہے کہ خطبوں کا مطالعہ کرے کیونکہ یہ خطبے رازِ ادب کا خزانہ اور حکمت و فلسفہ کا مجموعہ ہیں۔ انھیں کے ذریعے عربوں نے اپنے اجتماعات میں فخر کیا ہے، ان ہی میں امراء و سلاطین کے منبری بیانات ہیں، اسی کے ذریعے کلام کا معیار، اور خواص و عوام کی گفتگو کا انداز قائم ہوتا ہے، خطابت کے انداز پر انشا اور خطیبوں کے رنگ پر ادیبوں نے کام کیا، ابوہلال نے

وقد قال ابو هلال العسكريؒ في "الصناعتين"۔

"کتاب صناعتین" میں لکھا ہے :۔

- والرسائل والخطب متشاكلتان

خطوط اور خطبے کلام ہونے اور قافیہ وزن کی

في انهما كلام لا يلحقه وزن ولا تقفية، وقد يتشاكلان ايضا من جهة الالفاظ والفواصل، فالفاظ الخطب تشبه الفاظ الكتاب في السهولة والعذوبة، وكذالك فواصل الرسائل"

پابندی نہ ہونے کے لحاظ سے برابر ہیں، کبھی ان دونوں اصناف کی یک جہتی الفاظ و فواصل کے نقطۂ نظر سے بھی بیان کی گئی ہے، یعنی ادبا کی عبارتیں روانی و شیرینی میں اسی قسم کی ہوتی ہیں جیسے خطبوں کے درمیانی اجزاء و فواصل، یا خطوط کے پیراگراف۔

قال:

ابو ہلال نے کہا:۔

"والفرق بينهما ان الخطبة يشافه بها بخلاف الرسالة، والرسالة تجعل خطبة والخطبة تجعل رسالة في اليسر كلفة[لہ]۔ (الصبح الاعشیٰ۔ ج ۱ ص ۲۱۰)

رسائل و خطب میں فرق یہ ہے کہ خطبہ مخاطب کے سامنے ادا کیا جاتا ہے، بخلاف خط کے مگر خط کو خطبہ یا خطبے کو خط بنانا کوئی زیادہ دشوار کام نہیں۔

یہ اہمیت بڑی تیز رفتاری سے نمایاں ہوئی، کیونکہ اس کا آغاز ہی معتدل اور اخلاقی، دلکش اور نظر زیب ہے، اس سے پہلے ذہنی آوارگی تھی، اسلام نے ایک مقصد، ایک موضوع اور ایک اسلوب دیا، چنانچہ نظم و نثر ایک آہنگ پر آنے لگے، ان کے ادب میں "قرآن و حدیث" کا پرتو پڑنے لگا، اسلام نے نثر میں خطبوں، تقریروں، طویل نثری عبارتوں اور مکالموں کے علاوہ مختصر اور طولانی احکام، بیانیہ مضمون اور خطوط کا نمایاں اضافہ کیا۔

اس ادب کی تخلیق میں کعب بن لوی مشہور خطیب کی نسل کے بے مثال مجاہد "ابوطالب" سب سے

لہ یہ خیالات امیر المومنین ؑ کے خطبوں، اور خطوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ نہج البلاغہ اور عربی نثر کے مطالعے سے یہ روشنی تیز تر ہوتی ہے۔ (مرتضیٰ)

پہلے شاعر و خطیب ہیں جن کا کلام نظم اور تاریخی خطبۂ نکاح محفوظ ہے، ان کا مشہور لامیہ تاریخ ادب اسلام کا بہترین شہ کار ہے، لامیہ کا عنوان ہے :۔

خلیلیّ ما اذنی لاوّل عاذل بصغواء فی حقّ ولا عند باطل

میرے دوستو! میرے کان پہلے ملامت کرنے والے کی ملامت پر غور نہیں کرتے، نہ حق میں نہ باطل میں۔ (دیوان شیخ الاباطح اور زہرۃ الادبا فی شرح الامیۃ شیخ البطحاء طبع حیدریہ نجف ۱۳۵۶ھ)

علی ابن ابیطالبؑ کا ادبی پس منظر

جناب ابوطالب کی ادبی شخصیت، ان کی نثری اور شعری قابلیت کا اعتراف ایک طرف قریش کی زبان وادب، دوسری طرف گھر کا شخصیت ساز ماحول اور تمثال گر ماں باپ کی نظر محبت کے ساتھ ساتھ ہمت، جرأت، شجاعت، ذہنی استقامت اور ماحول پر چھا جانے کی صلاحیتیں سونے پر سہاگا بنی ہوئی تھیں، آغاز دعوت کے وقت حضرت علیؑ کی عمر نو دس سال ہی بتائی گئی ہے۔ اور سب نے لکھا ہے کہ ۲۷ رجب ۱ھ بعثت سے ۲۸ صفر ۱۱ھ تک کوئی موقع ایسا نہیں جب تلوار، قلم یا زبان سے دشمن کو جواب دیا ہو، ہر وقت مذہبی کشتیں، دن بھر مکالمے رہتے ہوں گے، ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ سب سے پہلے مددگار، جواں سال مجاہد، پُرجوش حامی ہونے کی وجہ سے زیادہ تر ان معرکوں سے دوچار ہوئے، پیغمبرؐ کے کاتب وپیامبر ہونے کی وجہ سے اکثر اہم سے اہم تر خط لکھے[1]، اور سورۂ برأت کی تبلیغ یا یمن میں کامیابی بتاتی ہے کہ اس عہد کے بولنے والوں میں علیؑ نڈر، تیز زبان اور عظیم الشان مقرر تھے۔

تاریخ حسب معمول تقریروں کے نقل کرنے میں بخیل ہے، لیکن ذکر اذکار کے طور پر جو کچھ لکھا ہے

---

[1] الصحیح الاعشی جلد اوّل

اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک لوگوں کو نثر سے اتنی دلچسپی نہیں ہوئی تھی کہ ان کے "فن پارے" "پسند عام" کی سند حاصل کرتے، البتہ "قرآن" ان کی زبان کا وظیفہ اور پسندیدہ ترین سرمایہ تھا کہ بحث و مناظرہ قصص و بیانات کا بڑا بھاری ذخیرہ ہے۔

۱۱ھ کے بعد عربوں کے معاشی، تمدنی اور ذہنی خیالات میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگا، لڑائیاں عربی سرحدوں سے آگے بڑھ گئیں، دعوت کے لئے دوسرے افراد اور دوسری زبان والوں سے پالا پڑا، اس لئے تحریر و تقریر میں طول، سلاست اور تفہیمی انداز زیادہ ہونے لگا، نظم میں بھی جدید رجحانات نمایاں ہوگئے اور نثر میں بھی تخلیق کا عمل شروع ہوا، ہر ایک کا اپنا اپنا انداز اور الگ الگ اسلوب تھا، ایران و روم آنے جانے سے جو نتائج رونما ہو سکتے تھے وہ بھی نمایاں ہوئے۔ جاحظ نے لکھا ہے:۔

"وجملۃ القول انّا لا نعرف الخُطَب الّا للعرب والفرس وامّا الھند فانّما لھم معانٍ مُدَوّنۃٌ وکتب مُجَلّدَۃٌ لا تضاف الی رجل ولا الی عالمٍ موصوف، وانما ھی کتب متوارثہ وآدابٌ علی وجہ الدّھر سائرۃ مذکورۃ۔

مختصر یہ کہ ہم عربوں اور ایرانیوں کے علاوہ کسی کی تقریروں سے واقف نہیں، کیونکہ اہل ہند کے پاس ایک علم ہے جو کسی آدمی کی طرف منسوب نہیں، بلکہ وہ صدیوں سے ان کے پاس چلا آرہا ہے اور وہ کتابیں نسلوں سے متوارث ہیں جس کے ادب نامعلوم مدت سے رائج ہیں۔

وللیونانیین فلسفۃ وصناعۃ منطق وکان صاحب المنطق نفسہ بکیّ اللسان غیر موصوف بالبیان، مع علمہ بتمییز الکلام وتفصیلہ ومعانیہ وبخصائصہ وھم یزعمون انّ جالینوس کان انطق النّاس، ولم یذکروہ بالخطابۃ ولا بھذا الجنس من البلاغۃ۔

یونانیوں کے پاس فلسفہ منطق تو ہے مگر یہ لطف ہے کہ خود ان کا موجد فن، کم سخن تھا، اور

اس کی قوتِ گویائی کا تذکرہ نہیں کیا جاتا، حالانکہ کلام، اندازِ کلام، تفصیلات وحقائق وخصوصیات سے باخبر تھا، یونانیوں کے خیال میں جالینوس بہت بڑا بولنے والا تھا، اس کے باوجود اس کی خطابت یا بلاغت کا ذکر نہیں ہے۔

وفی الفرس خطباء، الا ان کل کلام للفرس، وکل معنیً للعجم فانما هو عن طول فکرة وعن اجتهادٍ وخلوة وعن مشاورة ومعاونةٍ وعن طول التفکّر، ودراسة الکتب وحکایة الثانی علم الاول، وزیادة الثالث فی علم الثانی حتی اجتمعت ثمار تلک الفکر عند اخرهم۔

وکلّ شئ للعرب، فانما هو بدیهة وارتجال وکانه الهام ولیت معاناة ولا مکابدة، ولا اجالة فکرة ولا استعانة وانّما هو یصرف وهمه الی الکلام والی رجز یوم الخصام، اوحین یمتح علی راس بئر، اویحدو ببعیر، وعند المقارعة والمناقلة۔ اوفی صراع اوفی حرب، فما هو الّا ان یصرف وهمه الی جملة المذهب والی العمود الذی یقصد، فتاتیه المعانی ارسالا وتنثال علیه الالفاظ انثیالا ثم لا یقیده علی نفسه ولا یدرسه احد من ولده۔

وکانوا امّیین لا یکتبون ومطبوعین لا یتکلّفون، وکان الکلام الجیّد عندهم اکثر وهم اقدر واقهر، وکل واحد فی نفسه انطق، ومکانه من البیان ارفع، وخطباؤهم اوجز، والکلام علیهم اسهل، وهو علیهم ایسر من ان یفتقروا الی تحفّظ، اویحتاجون الی تدارس ولیس هم کمن حفظ علم غیره واحتذی علی کلام من کان قبله، فلم یحفظوا الّا ما علق بقلوبهم والتحم بصدورهم واتّصل بعقولهم من غیر تکلّف ولا قصد ولا تحفّظ ولا طلب وان شیًٔا الذی فی ایدینا جزء منه۔ (البیان والتبیین ج ۳ ص ۲۰-۳۱)

ایران میں البتہ خطیب گذرے ہیں، لیکن ایرانیوں کی ہر گفتگو اور عجمیوں کی ہر تقریر، ایک گہری فکر اور درس واجتہاد کا نتیجہ ہوا کرتی تھی، اس میں خلوت پسندی، مشورے میں احتیاط ہمدردی ہے، ان کے علم کو دوسرے کرنے پہلے سے اور تیسرے نے دوسرے سے لیا اور بڑھایا پھر سب کا نچوڑ آخری شخص کے پاس آگیا۔

رہے عرب اُن کے پاس جو کچھ ہے ارتجالیہ اور بدیہی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے الہام ہے کہ تکلیف محنت وزحمت کا نام بھی نہیں آتا، وہ رجز سناتا ہے، پانی کے لئے کنوئیں پر آتا ہے۔ گیت گاتا ہے، اونٹ ہنکاتا ہے، حدی (ترانہ) پڑھتا ہے، جنگ یا کشتی یا اور کسی موقع پر وہ پہلے اسلوب کو یا نمونے کو پیشِ نظر نہیں رکھتا، وہ واقعہ کے نتائج کو دیکھ کر رواں و مسلسل انداز میں سوچے بغیر بولتا ہے، پھر نہ ان باتوں کو قلمبند کرتا ہے، نہ اپنے بچوں کو سکھاتا ہے، اس لئے کہ وہ سب کے سب ان پڑھ تھے، لکھنا نہیں جانتے تھے، سادہ مزاج و تکلف سے ناآشنا تھے، ہاں باتیں کرنا خوب جانتے تھے، ہر ایک بہترین مقرر تھا۔

یہ مقرر مختصر گو، سہل پسند اور ایسے کہ ان کی تقریروں کو یاد کرنے کی ضرورت نہ پڑے یا پڑھنے کی احتیاج نہ ہو، نہ اُن کا یہ دستور تھا کہ دوسروں سے سیکھ کر اُن کے انداز پر چلتے اور ماضی کی روایتوں کو دہراتے۔

اُن کے دلوں میں جو بیٹھ گئی رہ گئی اور نہ یاد کرنے کا سوال ہی تھا، اُن کے پہلے سے نیت کرنے، تیار ہونے، جستجو کرنے کی فکر نہیں تھی، آج جو ذخیرہ ہمارے پاس ہے وہ اس خزانہ کا معمولی سا حصہ ہے۔

اسلامی ادب کے بارے میں جاحظ کا یہ بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کے تفصیلی تجزیہ کے بجائے یہ کہنا ہے کہ یونان، ایران وہند کے ادب سے واقفیت کی راہیں کھلنے کے بعد بھی خالص

عربی ماحول میں "ادب" کوئی مقام نہیں حاصل کر سکا تھا، اس دور کے ادبی نمونے بڑی حد تک محفوظ ہیں اور معاصرین و متاخرین نے حتی الامکان ان کو بچانے کی کوشش کی کہ لوگوں کو اس دور کے اکابر اور بڑی شخصیتوں سے عقیدت، ارادت اور دلی وابستگی تھی اور ان کا عربی دور انھیں بڑوں کا مرہون کرم ہے۔

بقول حسن سندوبی:۔

"وکانت العادۃ التی یکوّنون بھا معارفھم ویربّون بھا معلوماتھم لاتکاد تخرج عن حدّ الحفظ لکتاب اللہ الکریم وما ثبت لدیھم من احادیث الرسول صلوات اللہ علیہ واستظھار الجیّد من کلام خلفاء الراشدین وخطبھم الجامعۃ لاسیّما خطب الامام علی ورسائلہ البلیغۃ وکلماتہ البارعۃ۔ (مقدمۃ البیان والتبیین ص ۶)

وہ مواد جس سے ان ادیبوں کے ادب کی تکمیل اور معلومات میں باقاعدگی ہوتی تھی، وہ مندرجہ ذیل حدود میں گھرا ہوا تھا۔

(۱) قرآن (جس کے وہ لوگ حافظ تھے) (۲) احادیث (۳) خلفائے راشدین کے کلمات و خطبات ... ... حضوصاً امام حضرت علیؑ کی تقریریں اور معیاری ادب نواز خطوط، اور بے مثال کلمات ... ..."

چنانچہ اس دور کے ادیبوں میں "عبداللہ بن عباسؓ" جیسا ادیب و مفسر نے بار بار علیؑ کی ادبیت اور اس سے تاثر کو ظاہر کیا ہے، کبھی تو یہ کہا کہ:۔

مَا انْتَفَعْتُ بِمِثْلِ هٰذَا الْكَلَامِ :۔ (اس تقریر (خطبۂ امیر المومنینؑ) سے جس قدر میں نے فائدہ اٹھایا اور کسی سے نہیں اٹھایا)

یہ ابن عباس و ابوذر وہ ہیں کہ جنھوں نے عہد علی علیہ السلام ہی میں حضرت کی ادبیت اور

حفظ خطب کی بدولت ناقابلِ فراموش عظمت حاصل کر لی تھی۔

کلامِ علیؑ کی تاثیر زائی کے فنی وجوہ

"حسن زیات" کے بقول "امیر المومنینؑ کی زندگی قرآن، حدیث، تربیت رسولؐ اور ذاتی بلند نگاہی کے پرتو سے منوّر تھی، لہٰذا زندگی کا ہر پہلو معجزہ ہو سکتا ہے، مگر ایک تنقید نگار ادیب کے نفسیاتی رجحانات اور ادب کی عظمت کے راز معلوم کرنے کے لئے عام حالات دیکھنا ضروری ہیں تاکہ وہ اسباب سامنے آسکیں جن کی بنا پر اس ادب نے عربی ادب کو متاثر کیا، یہ اسباب مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں:۔

(۱) کلام علیؑ موضوع، مواد، ہیئت، اور مقدار کے لحاظ سے تمام سابقین و معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے۔ اس میں:۔

(الف) خطبے اور تقریریں۔

(ب) خط اور معاہدے۔

(ج) دعائیں اور مناجاتیں۔

(د) کلمات قصار اور فیصلے

(ہ) اشعار اور رجزیں ہیں۔ اور اشعار بھی ایسے کہ علامہ قلقشندی کہتے ہیں کہ:۔

وذکر صاحب "الریحان والریعان" عن سعید بن المسیب انہ قال:	صاحب ریحان و ریعان نے سعید بن مسیب کا قول نقل کیا کہ:۔
"کان ابوبکر و عمر یجیدان الشعر و علیؑ اشعر الثلاثۃ" (الصبح الاعشیٰ ۲۷۲/۱)	"ابوبکر و عمر اچھے شاعر تھے مگر حضرت علیؑ ان میں سب سے بڑے شاعر تھے۔"

پھر اس ذخیرہ میں اصولِ دین، احکام کی تشریح، تفسیر، نفسیات، واقعات، مشاہدات، فلسفہ، مناظر، جدّت، اخلاق، قانون، مملکت، اصولِ حیات سے بحثیں ہیں۔

چار سو کے قریب چھوٹے بڑے خطبے، سوا سو سے زائد خطوط، دو ڈھائی ہزار اشعار، اور اسی قدر مختصر کلمات کے اندر مندرجہ بالا مسائل نے بہر حال دیکھنے سننے والوں کو متاثر کیا۔

ابنِ عباسؓ، ابوالاسود دئلی، ہمام، صعصعہ، حارث اعور سے جاحظ و زمخشری[۱] جیسے مختلف نظریات کے افراد کی فنّی بلندیاں اور اُن کا اقرارِ تاثر پر گواہ ہے۔

(۲) اثر آفرینی کا دوسرا سبب کلام کی ہمواری اور اسلوب کی یکساں بلند آہنگی ہے، اَدب اور تاریخ کی چھوٹی بڑی کتابوں میں پھیلے ہوئے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دو تین (اور صرف دو تین) مقامات کے علاوہ صرف حضرتؑ ہی کا کلام ایک غیبی سروش، روحانی سکون، معصومانہ انداز اور غیر مشتعل و غیر منفعل انداز کا آئینہ دار ہے۔

وہ مقامات جہاں غیر معمولی اسلوب نظر آتا ہے، جیسے خطبۂ شقشقیہ، وہ بھی در اصل اسی پس منظر کے لحاظ سے ہے جو جنابِ امیرؑ سے متعلق تھا، اور نظریہ اس وقت اور اہمیت اختیار کر لیتا ہے جب اِن کلمات کا دوسرے اشخاص کے اقدامی یا جوابی گفتگو سے تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

---

[۱] تفسیر کشاف طبع کلکتہ ص ۵۱۷ میں ہے:۔

"وناهيك فى خطب امير المومنين رضى الله عنه فى ايام صفين ومشاهده مع البغاة والخوارج من البلاغة والبيان ولطائف المعانى وبليغات المواعظ والنصائح۔

صفین اور دوسرے باغیوں یا خارجیوں سے جنگ کے موقعوں پر امیر المومنینؑ کے خطبے کافی ہیں کہ ان میں بلاغتِ بیان، بہترین مطالب اور مؤثر ترین وعظ نصیحت ہے۔۔۔۔۔"

گفتگو میں نشیب و فراز کا اندازہ لگانے کے لئے ماہرینِ فن[1] کا عام فن پارہ کار آمد نہیں ہوتا، بلکہ انتہائی خوشی، غصہ اور انتہائی غم یعنی جوش آفرین مقامات، لائق مطالعہ ہوتے ہیں، امیرالمومنینؑ کے لئے انتہائی جوش آفرینی کے کئی موقعے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً وفاتِ پیغمبرؐ و وفاتِ معصومہؑ، خود اپنے آخری لمحاتِ حیات کے ان موقعوں میں جوش، یاس، شدتِ غم، فراوانیٔ جذبات کا اظہار غیر شعوری طور پر ناہموار ہوسکتا تھا، لیکن آپ دیکھیں گے کہ حضرتؑ ان موقعوں پر ایک معیاری صبر اور مثالی بصیرت پیش کرتے ہیں۔ دیکھئے آنحضرتؐ کے غسل کے وقت فرمایا ہے :-

بابی و امی یارسول اللہ لقد انقطع بموتك مالم ینقطع بموت غیرك من النبوۃ والانباء واخبار السماء ، وخصصت حتی صرت مسلیا عمن سواك، وعممت حتی صار الناس فیك سوآءً ولولا انك امرت بالصبر ونهیت عن الجزع لانفدنا علیك ماء الشؤن ولكان الدآء مماطلا، والكمد محالفاً، وقلا لك ـــ ولكنه لا یملك ردہ ولا یستطاع دفعه

بابی انت وامی ! اذکرنا عند ربك واجعلنا من بالك۔

(نہج البلاغہ طبع غلام علی لاہور ۶۳۹) (نہج البلاغہ ص ۲۵۵۔ ج ۱، شرح عبدالحمید)

(ترجمہ) میرے ماں باپ نثار ! یارسول اللہؐ آپ کی موت سے ایسی باتیں ختم ہوگئیں جو کسی اور کے مرنے سے نہیں ہوسکتی تھیں، نبوت کا سلسلہ جاتا رہا، غیب کی خبریں بند ہوگئیں، آسمانی پیام رک گئے، آپ نے گوشہ نشینی اختیار کی تو دوسروں کی

---

[1] اس سلسلہ میں جاحظ کا قول آگے پڑھیں گے۔

ضرورت نہ رہی اور مل بیٹھے تو تمام انسان ایک سطح پر کر دیئے، آپ نے خاموشی کا حکم اور تڑپنے سے روکا نہ ہوتا تو میں آنکھوں کے آنسو ختم کر دیتا، اور یہ سانحہ جان لیوا اور غم جان فرسا ہونے کے بعد بھی اپنی تاثیر ختم نہ کرتا۔ اس کے بعد بھی آئے آنسو پلٹانا اور نازل شدہ غم ہٹانا ممکن نہیں۔

میرے ماں باپ صدقے! ہمیں بھی اپنے پروردگار کے سامنے یاد کر لیجئے گا اور ہمیں بھی ذہن میں رکھئے گا۔"

یا حضرت معصومہؑ کے موقعہ دفن پر فرمایا تھا:۔

السلام علیک یا رسول اللہؐ! عنّی وعن ابنتک النازلۃ فی جوارک والسریعۃ اللحاق بک ـــــ قلّ یارسول اللہ! عن صفیتک صبری ورقّ عنہا تجلّدی، الا انّ لی فی التاسّی تعظیم فرقتک وفادح مصیبتک، موضع تعزٍّ۔ فلقد وسّدتک فی ملحود قبرک وفاضت بین نحری وصدری نفسک ـــــ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون ـــــ فلقد استرجعت الودیعۃ واخذت الرھینۃ، امّا حزنی فسرمدٌ وامّا لیلی فمسھّدٌ۔ الی ان یختار اللہ لی دارک التی انت بھا مقیم، وستنبّئک ابنتک بتضافر امتک علیٰ ھضمھا فاحفھا السؤال، واستخبرھا الحال، ھذا ولم یطل العھد ولم یخل منک الذکر

والسّلام علیکما، سلام مودّع لا قالٍ ولا سئمٍ، فان انصرف فلا عن ملالۃٍ وان اقم فلا عن سوء ظنٍّ بما وعد اللہ الصابرین۔

(نہج البلاغہ طبع غلام علی لاہور ص ۵۸۱ طبع مصر و حمید عبدہ۔ ج ۲ ص ۲۰۷)

ترجمہ:۔ یا رسول اللہ! میرا اور اپنی حاضر ہونے والی بیٹی کا سلام قبول کیجئے کہ وہ آپکے پڑوس میں آرہی ہے، اور اتنی جلدی آپ سے مل رہی ہیں، یا رسول اللہ آپ کی صاحبزادی کے غم میں میرا صبر تھوڑا اور قوتِ برداشت کم ہے۔

لیکن آپکے فراق کا صدمہ اس غم میں میرے لئے صبر آموز ہے کہ میں نے وہ سخت ترین سانحہ اور عظیم الشان واقعہ ہی نہیں بلکہ آپ کو اپنے ہاتھوں قبر میں اُتارا، میری ہی آغوش میں آپ نے آخری سانس لی۔ اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔ یا رسول اللہ مجھ سے آپ کی امانت واپس لے لی گئی، اب میرا غم ہو شربا ہو گیا، جب تک بھی زندہ ہوں۔

آپ کی بیٹی آپ کو اُمت کی بیداد سنائیں گی، ذرا پوچھ لیں، حالانکہ آپکی رحلت کو نہ تو زیادہ دن گذرے نہ آپ کی یاد فراموش ہوئی۔

اچھا پھر آپ دونوں سے رخصت ہوتا ہوں، لیکن یہ وداع دل تنگ ہو کر اور گھبرا کر نہیں بلکہ اگر استادہ رہوں (اور غمزدہ) تو کہیں وعدۂ خدا پر شبہ نہ ہو۔

پھر خود اپنی رحلت کے وقت فرمایا:۔

ایّھا النّاس! کل امرئٍ لاقٍ ما یفرّ منہ فی فرارہ، والاجل مساق النّفس والھربُ منہ موافاتہ۔

کم اطردتُ الایام ابحثھا عن مکنون ھٰذا الامر فابی اللہ اِلّا اِخفاءہ، ھیھات! علم مخزون ـــــ امّا وصیّتی فاللہ لا تشرکوا بہ شیئا، ومحمّد صلی اللہ علیہ و الہ فلا تضیّعوا سنّتہ ـــــ واقیموا ھٰذین

العمود ين واوقدوا هذين المصباحين وخلاكم ذم مالم تشردوا۔
حَمَّل كل امرئٍ مجهوده وَخُفِّفَ عن الجهلة ـــــ
ربٌّ رحيم، ودينٌ قويم، وامام عليم ـــــ
انا بالامس صاحبكم، وانا اليوم عبرة لكم، وغدا مفارقكم ـــــ
.... الخ (نہج ۔طبع غلام علی ص ۴۶۶)

ترجمہ:۔ لوگو! جس سے ہر شخص بھاگ رہا ہے، اس سے بہرحال دوچار ہونا ہے، موت توجان کی آخری منزل ہے، اس سے بھاگنا ہی اس کے پاس جانا ہے۔

میں مدتوں اس راز کی جستجو میں رہا، لیکن خدا نے اس کو پوشیدہ تر ہی رکھا۔

ہاں وہ ایک بھید ہے، میری وصیت ہے کہ شرک نہ کرنا اور محمدؐ مصطفےٰ کی اہمیت اور حضرت کی سنت کو فراموش نہ کرنا، ان دونوں (توحید و نبوت) ستونوں کو قائم اور ان دونوں چراغوں کو روشن رکھو، خدا تمھیں ہر عیب سے بچائے جب تک تم فراریت اختیار نہ کرو، خدا نے ہر ایک کو اس کی حیثیت کے مطابق مکلف بنایا، اور نادانوں پر فرائض میں سختی نہیں کی۔

یاد رہے خدا رحیم ہے، دین استوار ہے، امام بھی باخبر ہے۔ میں کل تمھارا ہم نشین اور آج عبرت، اور کل تمھیں چھوڑنے والا ہوں گا...... ..

بیعتِ سقیفہ کے موقع پر کوئی مشتعل تقریر یا تحریر تاریخوں میں نہیں، جنگِ جمل و صفین و نہروان میں کوئی اِنتقامی یا غیر اَخلاقی، ناہموار گفتگو نہیں فرمائی، جوابی کلام مخاطب کے انداز میں اس وقت ملتا ہے، جب عوام میں غلط فہمی یا حق کے چھپنے یا اس کے ذلیل ہونے کا موقع ہوا ہے۔

(۳) یقین کی پختگی، بیان کا خلوص اور خلوص کا رچاؤ، اعتقادات و معارف کی وہ جلوہ گری ہے کہ سننے والے تو جو اثر لیتے ہوں گے، وہ وقت کے ساتھ تھا، مگر آج بھی پڑھنے والا ایک دنیائے الہام و نوائے سروش، زبانِ علیؑ و صدائے موجِ اعجاز میں امتیاز نہیں کر سکتا کہ " فوق کلام المخلوق " بشری انداز و ادب سے بلند تر و ممتاز نظر آتا ہے۔

حمد و ثنا، توحید و عرفان، تفسیر و حدیث، فلسفہ و سائنس، اخلاق و قانون، زندگی و موت، دنیا و آخرت، مادّہ و روح، ارضیات و فلکیات، پھر جو کچھ اس ماحول میں کہا جا سکتا تھا فرمایا، اور اس معیار پر کہ عقلِ انسانی دنگ ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی تخلیق ہر شعور کو متاثر کرتی ہے، لاشعور پر اس کا اثر ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ایسے ادب سے دوچار ہونے والا ادیب اپنے فن میں اس کا پر تو ظاہر نہ کرے۔

(۴) بے ساختگی اور آمد، کلامِ علیؑ کا بہت بڑا اور اہم خاصّہ ہے۔

ادب پارے کی تخلیق میں تراش، خراش، کاٹ چھانٹ اور اصلاح کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایسے ادیب کے بارے میں جو رائے قائم کی جائے وہ ایک طرف اور سارتجالیہ ادب پر رائے دوسری طرف رکھ کر دیکھی جائے تو دونوں میں بڑا فرق معلوم ہوگا، خلفائے راشدین جن کے ادب سے عربی ادب کا تاثر مشہور ہے، اپنی تقریروں کے لحاظ سے تین قسم کے تھے۔ خطیب و ادیب جیسے جناب ابوبکر و عمر کم سخن، جیسے جناب عثمان۔ ان میں سے بقول حضرتِ عثمان اوّل الذکر دو حضرات تقریریں تیار کر کے آتے تھے۔ (ملاحظہ ہو البیان والتبیین ج ۲۔ ص ۱۹۵) پھر حضرتِ عمر شعر کے حسن و قبح کے جوہری تھے مگر تقریر، مجلسی گفتگو اور بعض خطبوں کے لئے ان کا قول ہے:۔

ما تتصعد فی کلام کما تتصعد فی خطبۃ النکاح

مجھے خطبۂ نکاح جیسی الجھن کسی گفتگو کے موقع پر نہیں ہوتی لیکن علیؑ کے خطابئے فوری اور ارتجالی، فی البدیہہ اور بیساختہ ہوتے تھے، پشتِ فرس، فرشِ مسجد، منبر و بازار ہر جگہ ان کا اعلان کہ :-

"سلونی قبل ان تفقدونی" جو پوچھنا چاہو پوچھ لو ——— !

لوگ پوچھتے تھے اور آپ بتاتے تھے اور اس طرح کہ اس سے پہلے تو کیا" اس کے بعد بھی شاید کسی نے نہیں بتایا۔ حارث اعور کہتے ہیں :-

واللہ ! لقد رایت علیاً وانہ لیخطب قاعداً کقائم ومحارباً کمسالم ———

• یرید بقولہ قاعداً "خطبۃ النکاح" (البیان والتبیین ج ۱۔ ص ۱۱۔ از جاحظ)

(۵) امیر المومنینؑ دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں خود مؤلف و مصنف بھی تھے، انھوں نے قرآن لکھا، حدیثیں جمع کیں، خود اپنے تاثرات و تعلیمات قلمبند فرمائے، خلفائے راشدین و عام صحابہ میں سے کسی نے بھی حضرتؑ جیسے آثار قلم نہیں چھوڑے۔

"حضرت کا وصیت نامہ" دستور" بنام مالکِ اشترؒ" جیسے گرانقدر ادبی و فلسفی تصنیفات کی قیمت و اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

(۶) آخری بات یہ ہے کہ علیؑ اپنے معاصرین میں اسلوبِ قرآن سے اس حد تک متأثر ہوئے کہ اُن کے کلام کو "فوقِ کلامِ مخلوق" کہا جانے لگا۔

حضرتؑ کی تحریر و تقریر میں قافیہ سنجی، روانی، اشارات نگاری، سجع اور معجز انداز بالکل قرآن و خطب نبیؐ کا سا ہے، جسے عربی ادب کا کوئی ماہر جھٹلا نہیں سکتا۔

عربی ادب سے ان تاثرات کی نشاندہی

اصل میں ایسے ثبوت فراہم کرنے کی کوشش اس وقت کرنا پڑتی جب کہ کوئی شخص ہمارا سابقہ دعویٰ نہ مانے لیکن شاید آج تک کوئی ایسا صاحب علم اور کوئی زبان گویا اس تاثیر کی منکر نہیں ہوئی لیکن موضوع کو اُجاگر اور روشن کرنے کے لئے چند بیانات حاضر ہیں۔

(۱) ابوالاسود دوئلی (متوفی ۶۷ھ) سے حضرتؑ نے کچھ باتیں کہیں تھیں کہ عربی ادب کا بنیادی اور پہلا قلعہ "علم نحو" تیار ہوگیا، اور آج تک عربی ادب و زبان اسی سرچشمہ کے آب حیات سے سیراب ہورہی ہے۔ "حضارۃ العرب" کے مؤلف اسعد داغر لکھتے ہیں کہ ابوالاسود نے حضرت علیؑ کی اصولی تقریر قلمبند کرکے حضرت کو اصلاح کے لئے دکھائی تھی۔ قلقشندی کا بیان ہے کہ "یہی ہم نشین علیؑ تھے جنھوں نے قرآن پر اعرابی نقطے لگائے۔ (صبح الاعشیٰ ۱/۴۲۰)

(۲) عربوں میں کلام علیؑ کی روایت اور شہرت اتنی عام تھی کہ ان کے خطیب و مقرر غیر شعوری طور پر حضرت کے جملے اور اسلوب اپناتے اور بے ساختہ ان ملفوظات گرامی کو استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ابن عبدربہ نے۔ (العقد الفرید (ج ۲ - ص ۳۳ میں) لکھا ہے:-

العتبی، قال، قال عبد اللہ بن الاھتم:-

مات لی ابن وانا بمکۃ فجزعت جزعاً شدیداً فدخل علیّ علیّ بن جریح یعزّینی، فقال لی:-

"یا ابا محمد! اسلُ صبراً واحتساباً، قبل ان تسلو اغفلۃً ونسیاناً کما تسلو البھائم" ــــــ وھذا الکلام لعلی بن ابی طالب کرم اللہ وجھہ لیعزی الاشعث بن قیس ابن لہ، ومنہ اخذہ ابن جریح، وقد ذکرہ حبیب فی شعرہ:-

وقال علیؑ فی التعازی لاشعثٍ　　وخاف علیہ بعض تلک المآثم

اتصبر للبلویٰ عزآءً وحسبۃً　　فتوجر ام تسلو اسلّوا البہائم

"اتی علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الاشعث لیعزیہ عن ابنہ، فقال: "ان تحزن فقد استحققت ذلک منک الرحم، وان تصبر فان فی اللہ خلفا من کل ھالک، مع انک ان صبرت جری علیک القدر وانت ماجور، وان جزعت علیک القدر وانت آثم"

بروایت عتبی، عبداللہ بن اہتم نے کہا کہ ان کا ایک لڑکا مرگیا ان دنوں یہ مکہ میں تھے اس غم میں بہت بے چین ہوئے۔ ابن جریج ماتم پرسی اور تعزیت کیلئے آئے اور کہا:۔

"ابو محمدؐ! راضی برضا رہ کر صبر کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ لاشعوری طور پر صبر کرنا پڑے، جو حیوانوں کی جیسی بیچارگی ہوگی ——"

ابن عبدربہ لکھتے ہیں کہ یہ علی ابن ابیطالبؑ کے کلام سے ماخوذ ہے جیسے حبیب نے پہنے خرد ا بیں لکھا ہے:۔ "وقال علیؑ .. ..

ہوا یہ کہ علیؑ اشعث کے لڑکے کی تعزیت کیلئے تشریف لائے اور فرمایا: "اگر غم کرتے ہو تو واقعی تمھیں حق ہے کہ خون تھا، ہاں اگر صبر کرو تو خدا ہر مرنے والے کا نعم البدل بھی دیتا ہے، اور یہ بھی کہ مشیّتِ خدا جاری ہو چکی ہے، تمھیں صبر ملے گا، لیکن اگر روئے پیٹے تو موت رُک نہیں سکتی اور تمھیں بہر حال گناہ ہوگا"۔

اِس عبارت سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(الف) حضرتؑ کا کلام ادیبوں پر چھایا ہوا تھا اور شاعر و نثار دونوں جانتے تھے کہ اِس کلام کے اقتباس کا فائدہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو الصبح الاعشیٰ ج ۱۔ ص ۵۹۔

(ب) حبیب و عتبی دونوں نے شعوری طور پر ایسا کیا اور ناقدینِ ادب نے انھیں سراہا۔

(ج) سیّد رضیؒ اس جیسے اہم اور پُرتاثیر کلام سے واقف تھے، اور نہج البلاغہ میں اہتمام کے ساتھ ایسی ہی چیزوں کو محفوظ کیا ہے :-

چنانچہ ابن عبدربہ کے نقل کردہ جملوں کو تین مختلف روایتوں کے طور پر تحریر فرمایا ہے ۔

(دیکھئے نہج البلاغہ طبع غلام علی ص ۹۸۱ و ۱۰۰۰)

ادباء العرب فی الاعصر العباسیہ کا مؤلف (؟) کتب خانہ و دارالترجمہ مامون الرشید سھل بن ھارون کے بارے میں لکھتا ہے :-

ویقال ان طریقتہ علی بن ابیطالب	کہتے ہیں کہ سہل کا انداز تحریر اسلوب امیرالمومنین
لا یتکلف لکلامہ فلا یشاھد فیہ الناقد	جیسا ہے، وہ عبارت میں تصنع نہیں کرتا، چنانچہ تنقید نگار
اثرا للتعمل ۔ (حاشیہ ادباء العرب ص ۱۴۶ طبع ۴)	کو اس کے یہاں تکلف کا نام نہیں ملتا ۔

عربی ادب کی روایت و شوق مطالعہ کے بعد درس و تدریس، جمع و تالیف کا دور آیا، ادیبوں نے جمع و تالیف قلمبند و تحریر کرنے کی طرف توجہ کی اس دور میں عبداللہ حجعفی جو معاویہ کا طرفدار تھا، کلامِ علیؑ کا شیدائی ہوا اور اپنی آزادہ روی کے باوجود کلامِ علیؑ کو "خطب امیرالمومنینؑ کے نام" سے مرتب کر گیا ۔ "خلیل نے" دائرۂ معارف علوی" میں لکھا ہے :-

" مالکِ اشتر بہ حارث اعور ہمدانی کہ خود فقیہہ و از صاحبان اسرار علیؑ است، روزے کہ غائب از استماع خطبۂ جمعۂ امام بود ۔ نوشتۂ آن را می داد کہ من آنرا نوشتہ ام "

ایک مرتبہ حارث (جو فقیہہ تھے) جنابِ امیرؑ کے خطبۂ جمعہ میں حاضر نہ تھے تو مالکِ اشترؓ نے حضرتؑ سے سن کر لکھا ہوا خطبہ حارث کو دیا کہ لیجئے یہ میں نے لکھا ہے "۔

اور مالکِ اشتر ایک ہی لکھنے والے نہ تھے بلکہ اور بہت سے لوگ تھے جو خطبے یا قضایا وغیرہ لکھا کرتے تھے ۔ حسنِ بصری حسن کے اقوال و کلمات علمائے ادب نے بڑے اہتمام سے نقل کیے ہیں ۔

(خصوصاً جاحظ نے) یہ بھی حاضر ہوتے اور لکھتے تھے، بلکہ ان کے لئے تو یہ واقعہ بھی ہے کہ:۔

"حسن بصری در بصرہ کنار جمعیت انبوہ در مسجد با قلم دوات مشغول بود ہے، امیر المومنینؑ از بالائے منبر اور اصدا زد، کہ "اے حسنؑ! چہ کار می کنی؟"

گفت:۔ "کلام شمارا، می نویسیم کہ بعد روایت کنم!"

(دائرۃ المعارف علوی جلد اول ص۶۶)

حسنِ بصری، بصرہ کی مسجد میں، ایک مجمع میں قلم دوات لئے بیٹھے تھے اور لکھ رہے تھے کہ۔ حضرتِ علیؑ نے منبر پر سے آواز دی:۔ "حسن بصری کیا کر رہے ہو؟"

حسن:۔ "آپ کا کلام قلمبند کر رہا ہوں کہ روایت (نشر) کروں"!

امالی میں سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے حسنِ بصری متوفی ۱۱۰ھ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

وکان الحسن بارع الفصاحۃ، بلیغ المواعظ، کثیر العلم وجمیع کلامہ فی الوعظ وذم الدنیا، جلہ ماخوذ لفظاً ومعنیً او معنیً دون لفظ من کلام امیر المومنین علیہ السّلام فھو القدوۃ والغایہ"۔ (غرر الفوائد ودرر القلائد، امالی مرتضیٰؒ طبع ایران ص۵۸)

حسن بصری مشہور ادیب اور کامیاب واعظ وعلامہ تھے، ان کی تمام تقریریں خواہ وعظ ہو یا مذمتِ دنیا اور ذکر موت سب جناب امیرؑ کے لفظوں اور معنوں کی نقل ہیں، یا کم از کم مفہوم ہر جگہ حضرت ہی سے لیا ہے، کیونکہ حضرتِ امیر المومنینؑ ہی اس فن کے قائد وانتہا تھے۔

ہم نے "ماخذ نہج البلاغہ" کے عنوان سے ایسے اشخاص کی نشان دہی کی ہے۔ (ملاحظہ ہو اخبار سرفراز لکھنؤ رجب نمبر ۵۲ ۱۹ء نیز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منہاج نہج البلاغہ از سبط الحسن ہنسوی اور مقالہ جناب امتیاز علی صاحب عرشی) یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ عربی لٹریچر میں یہ پہلا ادبی ذخیرہ کتابوں کی شکل اختیار کر سکا، اور اس طرح کلام علیؑ ادب پر چھا گیا، چنانچہ

پہلی صدی کے مشہور مؤلفین و مرتبین کلام علیؑ کے نام :-

(۱) حارث اعور (۲) مالک اشتر (۳) زید بن وہب جہنی (متوفی ۹۶ھ) (۴) عبداللہ بن رافع۔

دوسری صدی میں :-

(۱) نصر بن محمد مزاحم (ان کی کتاب وقعۃ الصفین آج بھی موجود ہے) (۲) اسمٰعیل بن مہران سکونی۔ (۳) ابو منذر ہشام بن محمد کلبی سائب متوفی ۱۴۷ھ۔ (۴) ابو مخنف لوط بن یحییٰ۔

تیسری صدی میں :-

(۱) محمد بن عمر قدسی متوفی ۲۰۷ (۲) ابو اسحاق ابراہیم بن محمد سعید المتوفی ۲۸۳ھ (۳) ابوالحسن مداینی متوفی ۲۱۵ھ (۴) عبداللہ بن احمد شہید کربلا) بن عامر (شہید صفین) (۵) عمرو بن بحر جاحظ متوفی ۲۵۵ھ اسی جاحظ کے مجموعہ کلام علی کی عربی شرح اور فارسی کا منثور و منظوم ترجمہ وطواط متوفی ۵۷۳ھ کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ (۶) ابراہیم بن ظہیر فزاری (۷) ابو محمد مسعدہ بن صدقہ عبدی۔

چوتھی صدی میں :-

(۱) ابوالقاسم عبدالعظیم بن عبداللہ حسنی (۲) عبدالعزیز بن یحییٰ متوفی ۳۳۰ھ (۳) ابوالخیر درازی (۴) ابراہیم بن سلیمان نہشمی (۵) علی بن محمد بن عبداللہ مداینی متوفی ۳۳۵ھ (۶) عبیداللہ بن ابی زید انباری (۷) قاضی بن سلامہ، مؤلف "دستور معالم الحکم"

اسی زمانے میں مسعودی متوفی ۳۴۶ھ نے لکھا ہے کہ :-

"والذی حفظ الناس عنہ من خطبہ فی سائر مقاماتہ اربعمأۃ خطبۃ ونیف و ثمانون خطبۃ یوردھا علی البدیھۃ ـــ تداول الناس عنہ قولاً وعملاً"

(مروج الذہب ج ۲ ص ۴۵ طبع مصر ۱۳۴۶ھ)

ان میں سے جو خطبے لوگوں کے پاس رہ گئے وہ چار سو اسّی سے کچھ زیادہ ہیں، جنھیں حضرتِ علیؑ بدیہہ اور ارتجالی طور پر دیتے تھے، یہ خطبے لوگوں میں قول و عمل کے طور پر رائج ہیں۔

پانچویں صدی میں :۔

جن لوگوں نے پانچویں صدی میں کام کیا وہ تو کیا، مگر اشعر ہاشمین ادیب بے مثال، نقیب الطالبین، سیّد محمدؒ، ابوالحسن رضی موسوی، مولود ۳۵۹ھ متوفی، محرم ۴۰۶ھ نے بے شمار ماخذ اور لاتعداد روایات میں سے اپنے معیاری ذوق کے مطابق "کلام علیؑ" کا انتخاب مرتب کیا، اور اس کا نام رکھا۔ "نہج البلاغہ"۔

اِس انتخاب کا اثر کیا ہوا؟ اسے ہم بعد میں لکھیں گے، یہاں کہتے چلیں کہ بیان کردہ فہرست میں دینوری متوفی ۲۸۱ھ، جاحظ متوفی ۲۵۵ھ، طبری متوفی ۳۱۰ھ، ابن درید ۳۲۱ھ، ابن شعبہ حلبی ۳۲۰ھ، ابن سلام جمحی مبرّد متوفی ۲۸۶ھ ابن عبدربہ متوفی ۳۲۸ھ، اور شیخ صدوق متوفی ۳۸۱ھ اور ان کی کتابیں ستّر ہیں۔ علماء حدیث کے مجموعے بھی ملا لئے جائیں تو خدا جانے یہ باب کس قدر وسیع ہو جائے۔

(۳) تمام بڑے انشاء پرداز کلامِ علیؑ سے مستفید ہونے کا اقرار کرتے ہیں، چنانچہ عربی ادب کا عظیم ترین ادیب فن کار عبدالحمید بن یحییٰ متوفی ۱۳۲ھ کہا کرتا تھا کہ:۔

"حَفِظْتُ سَبْعِیْنَ خُطْبَةً مِنْ خُطَبِ الْاَصْلَعِ[1] ففاضت ثم فاضت"۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱، ص ۸)

میں نے امیرالمومنینؑ کے ستّر خطبے یاد کئے ... کہ ادب میں روانی آئی اور ایسی کہ

---

[1] قال الثعلبی، کان الصلع فی عمر وعثمان وعلی ومروان بن الحکم وعمر بن عبدالعزیز الصبح الاشفے "۲۴۴") لیکن نہ معلوم کس وجہ سے لقب امیرالمومنینؑ ہی کا قرار پا گیا۔

.... .. زعم اهل الد واوین انہ لولا کلام صلوٰۃ اللہ علیہ وخطبہ وبلاغتہ فی منطق ما احسن احد ان یکتب الی امیر جنب ولا الی رعیتہ "

(فوائد رضویہ ج ۲۔ ص ۵۲۲۔ درضمن تذکرہ ابن عمید)

شاہان و خلفاء اور عرب کے انشاء پردازوں کا کہنا ہے کہ اگر حضرت علیؑ کا کلام اور حضرت علیؑ کے خطبے نہ ہوتے تو کوئی شخص اپنے لشکر یا اپنی رعایا کو دو سطریں بھی نہ لکھ سکتا۔

ابن مقفع متوفی ۱۴۲ھ جیسے ماہر و صاحب طرز ادیب کی زبانی حسن سندوبی مصحح البیان والتبیین نے لکھا ہے۔

شربتُ من الخطب ریّا ولم اضبط لها رویّا، ففاضت ثم فاضت۔ (حاشیہ ج ۱ ص ۱۰۹)

"میں نے علیؑ کے خطبوں سے پوری طرح سیرابی حاصل کی اور کوئی راستہ باقی نہ چھوڑا، چنانچہ موجودہ روانی اسی کا اثر ہے۔"

ابن ابی الحدید نے ابن نباتہ متوفی ۳۷۴ھ کا قول نقل کیا ہے کہ:۔

حفظت من الخطابۃ کنزا لا یزیدہ الانفاق الا سعۃ وکثرۃ ۔ حفظت مأۃ فصل من مواعظ علی بن ابی طالب۔ (شرح نہج ص ۸۔ ج ۱ طبع مصر)

میں نے تقریروں کا وہ خزانہ حفظ کیا ہے کہ جس کا استعمال اس میں اضافہ ہی کر رہا ہے اور وہ خزانہ علیؑ کے یاد کردہ سو خطبے ہیں۔

متداول درس اور نصاب تعلیم میں نہج البلاغہ کا ہونا اس کی تاثیر آفرینی کا ایک اور ذریعہ ہے۔ تمام شارحین نہج البلاغہ (جو سو کے لگ بھگ ہیں) اس کے متعلم و مدرس رہ چکے ہیں۔ حضرتؑ کی دعائیں، اشعار، قضایا، فیصلے، ادب ادیب کے لئے حرز جاں بنے، کیونکہ آپ کا کلام محمد عبدہ محمد حسن نائل مرصفی عبد الحمید.. .. محی الدین، فواد افرام، عمر فروخ، علی نقی، فیض الاسلام، جرجی جیسے

زندہ ادیبوں کے لئے بھی ایک اعجاز دمِ عیسیٰ، اور فوق البشر ثابت ہوا۔

(احمد حسن زیات تاریخ ادب عربی میں لکھتے ہیں:)

"لا نعلم بعد رسول اللہؐ فیمن سلف وخلف، افصح من — علیؑ فی المنطق۔۔۔۔ ووصفہ بطاؤس، والخفاش، والدنیا وعھدہ للاشتر النخعی — ان صح ذالک — تعد من معجزات اللسان العربی" (کتاب مذکور، ص ۱۷۳، طبع عاشر)

رسول اللہؐ کے بعد ماضی وحال میں "علیؑ" سے بڑا فصیح ومقرر نہیں ملتا۔۔۔۔ حضرت علیؑ کے خطبے طاؤس، خفاش اور دنیا پر تقریریں، اور مالکِ اشتر کے نام دستور، عربی ادب کے معجزوں میں شمار ہوتے ہیں۔ محمد فروخ "دراسۃ نھج البلاغۃ" میں لکھتے ہیں:۔

"یاتی نھج البلاغۃ فی المرتبۃ الثالثۃ بعد قرآن الکریم والحدیث الشریف، وان الفاظہ وتراکیبہ ومانیہ من وجہ البلاغۃ وراء کل نقد وفوق کل اسند ذالک" (ص ۱۱، طبع مصر ۱۹۴۴ء)

"کلامِ علیؑ کا انتخاب "نہج البلاغہ" قرآن وحدیث کے بعد دوسرا درجہ رکھتا ہے کہ اس کی لفظیں ترکیبیں اور ادبیت تنقید وتبصرہ سے بلند ہے۔"

چند مآخذ

(۱) البیان والتبیین (۲)	جاحظ، بشرح حسن سندوبی	طبع مصر ۱۹۳۲ء	
(۲) العقد الفرید (۲)	ابن عبدربہ	″ ″	۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء
(۳) الصبح الاعشیٰ (۱۴ جلدیں)	شیخ ابوالعباس احمد قلقشندی	″ ″	۱۳۳۱ھ ۱۹۱۲ء
(۴) التاریخ الادب العربی	حسن زیات	″ ″	بارہم

(۵) شرح نہج البلاغہ	ابن ابی الحدید معتزلی سنّی	طبع مصر سنہ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء
(۶) منہاج نہج البلاغہ	سبط الحسن ہنسوی	” لکھنؤ سنہ ۱۹۵۴ء / ۱۳۷۴ھ
(۷) مقدمہ ابن خلدون	ابن خلدون	” قاہرہ سنہ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۶۱ء
(۸) جواہر الادب (ج ۲)	سیّد احمد ہاشمی	مطبع سعادت مصر سنہ ۱۳۵۶ھ
(۹) المجمل فی تاریخ ادب العرب	محمد بہجۃ الاثری	
ج اوّل		بغداد سنہ ۱۹۲۹ء
(۱۰) تاریخ ادب اللغۃ العربیہ (ج ۲)	محمد بک وہاب	مطبع ترقی مصر سنہ ۱۹۰۰ء / ۱۳۱۸ھ
(۱۱) فہرس الطوسی	منتجب الدین	طبع کلکتہ
(۱۲) فہرس نجاشی	علامہ طوسی	بمبئی
(۱۳) فہرست کتب خطی کتابخانہ	عبد العزیز	طبع مہر، ایران
عمومی معارف (ج ۱)	جواہر الکلام	سنہ ۱۳۱۳ شمسی
(۱۴) دیوان شیخ الاباطح	ابن جنی	نجف سنہ ۱۳۵۶ھ
(۱۵) الروائع (۱)	فواد افرام	بیروت سنہ ۱۹۳۷ء
(۱۶) دراسۃ نہج البلاغہ الامام علیؑ	ڈاکٹر عمر فروخ	بیروت سنہ ۱۹۳۴ء

MURTAZAVI LIBRARY
کتابخانہ مرتضوی

کتابخانہ مرتضوی، یادگارِ علامہ فاضل لکھنوی، کراچی، پاکستان
murtazavilibrary@gmail.com

اِدارۂ تعلیماتِ الٰہیہ

زیر سرپرستی قائمِ آلِ عبا حضرت حجۃ عجل اللہ فرجہ

یہ ادارہ عقائد و معارفِ اسلام اور آلِ محمد علیہم السلام کے علمی پیغامات کی نشر گاہ ہے، آپ بھی ادارہ کی رکنیت قبول فرما کر ناصرانِ امامِ عصر عجل اللہ فرجہ کی فہرست میں اپنا نام درج کرائیے۔

اقسام و شرائطِ رکنیت

اس ادارہ کے مُربی وہ حضرات ہوں گے جو ادارہ کو یکمشت پانچ سو ۵۰۰ روپیہ مرحمت فرمائیں۔

نگراں وہ حضرات شمار کئے جائیں گے جو مبلغ تین سو ۳۰۰ روپے یکمشت مرحمت فرمائیں۔

محسنین ادارہ وہ حضرات متصور ہوں کے جو مبلغ ایکسو ۱۰۰ روپے یکمشت مرحمت فرمائیں۔

(مُربیان و نگران و محسنین ادارہ کی خدمت میں تمام مطبوعات گذشتہ و آئندہ بلا طلب و بلا قیمت تا بقائے حیات انشاء اللہ ارسال ہوتے رہیں گے)

رکن دوامی وہ حضرات ہوں گے جو مبلغ پچاس ۵۰ روپے مرحمت فرمائیں، ان کی خدمت میں تاریخ رکنیت کے بعد سے تمام مطبوعاتِ ادارہ بلا طلب و قیمت تا حیات انشاء اللہ ارسال کئے جائیں گے۔

رکنِ عمومی وہ حضرات ہوں گے جو پانچ روپے سالانہ مرحمت فرماتے رہیں، ارکانِ عمومی کو دورانِ سال کے مطبوعات بلا طلب و قیمت روانہ کئے جائیں گے۔

نوٹ

ادارہ کی عمومی رکنیت کا سال سرپرست ادارہ حضرت حجۃ علیہ السلام کی ولادتِ باسعادت کی مناسبت سے ۱۵ شعبان المعظم سے شروع ہوتا ہے۔

ناظمِ ادارہ ۲/۳۲۱ ڈرگ روڈ کالونی، کراچی (پاکستان)

مطبوعاتِ ادارہ

خدا شناسی	۴ آنے	حضرت سکینہ بنت الحسینؑ	۵ آنے
پیغمبری	۴ آنے	اسلام میں غلامی	۳ آنے
رہبری	۱۰ آنے	تاریخ کا خونی ورق	۴ آنے
جہادِ حسینی	۱۲ آنے	فلسفۃ المذہب	۴ آنے
صلح امام حسنؑ	۶ آنے	خصوصیاتِ اسلام	۲ آنے
حضرت علیؑ کے خطوط ..	۱۲ آنے	النبیؐ	۳ آنے
اُسوۂ حسینی	۴ آنے	الاعجاز	۲ آنے
علیؑ کی ذات و بات	۲ آنے	المعراج	۲ آنے
حسینؑ اور احساسِ فرض ..	۲ آنے	براقِ نبویؐ	۲ آنے
وزرائے عاشورا اصحابِ امام کی تقریریں	۳ آنے	نہج البلاغہ کا ادبی مطالعہ	۸ آنے

حسنِ مجتبیٰؑ و شہیدِ کربلا کا نظریۂ صلح و جنگ .. .. .. ۵ آنے

ادارۂ تعلیماتِ الٰہیہ

۲/۳۲۱ ڈرگ روڈ کالونی کراچی